اسلام علیکم!

ہمیں اپنے Blog Kitabdost

http://kitabdostpk.blogspot.be

اور readingpoint

http://readingpointpk.blogspot.be

کے لیے لکھاریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے ناولز
لکھ سکیں جو خواتین و حضرات شوقین ہیں وہ
ہمیں اپنی تحریر (ناول،ناولٹ،افسانہ قسط وار ناول)
اس میل آی ڈی پہ سینڈ کر سکتے ہیں

maisrasultan@gmail.com

فیس بک پہ بھی اس میل کے زریعے رابطہ کریں

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

ام طیفور

تم سے تم تک

اداس شام میں قبرستان کا ماحول بے حد سوگوار تھا۔ ایک ترتیب اور سلیقے سے بنی قبروں کے اوپر پڑے پھول بھی وحشت زدہ محسوس ہوتے تھے۔ یہ امریکہ کے شہر کیلیفورنیا کے ایک قبرستان کا منظر تھا جو مسلم کمیونٹی کے لیے مختص تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایک مختصر سا سوگواران کا قافلہ کاندھوں پر جوان لاشے کا تابوت اٹھائے گیٹ سے داخل ہوا اور پہلے سے کھدی ہوئی قبر کے پاس آ ٹھہرا۔ نہ کوئی ماتم، نہ آہ و بکا۔ بس دھیمی دھیمی سسکیاں اور رنج و الم سے چور چہرے۔ کچھ ہی دیر میں بے حد احتیاط کے ساتھ میت کو قبر میں اتارا گیا۔ ایک ادھیڑ عمر وجود لپک لپک کر قبر کی اور جانے لگا جسے دو مضبوط مردانہ ہاتھوں نے نرمی سے کھینچ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص مٹی کا ڈھیر بنا وہیں قبر کی گیلی مٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

یہ ایک دل دکھا دینے والا منظر تھا جس نے وہاں کھڑے ہر نفس کی آنکھ بھگو ڈالی تھی۔ وہ حسرت و یاس سے ٹکٹکی باندھے مرنے والے کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی جان سے عزیز تر چہرہ ہمیشہ کے لیے چھپ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قبر مٹی سے بھرتی چلی گئی اور بس۔ کہانی ختم۔ ایک جیتا جاگتا، ہنستا کھیلتا وجود اپنی

مکمل ناول

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

ہزاروں امنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کی گٹھڑی کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر گیا تھا۔

☆☆☆

اس کا جہاز جس وقت ائیر پورٹ پر لینڈ ہوا، دن کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ وہ پہلی بار پاکستان آیا تھا، اس لیے اسے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر اس نے اپنے مختصر سے سامان پر مشتمل ٹرالی بیگ کو دائیں ہاتھ سے تھاما اور بائیں ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے خود کو کمپوز کرنے کے لیے ایک طویل سانس لی اور ٹرالی گھسیٹتا باہر آیا۔

یہاں مسافروں کو لینے کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں، جوش اور خوشی سے چہکتی بولیاں۔ جس کا جتنا قریبی رشتے دار تھا، اتنا ہی انداز جوشیلا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ارد گرد دوڑائی، گو کہ اس کے آنے کی یہاں اطلاع دے دی گئی تھی مگر پھر بھی اسے دھڑکا سا تھا کہ اگر کوئی اسے لینے نہ آیا تو۔

''اچھا ہے۔ اگلی ہی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔'' اس نے دل میں سوچا اور ائیر پورٹ سے باہر نکل آیا اور یہیں ایک طرف کھڑے لڑکے کے ہاتھ میں تھامے پلے کارڈ پر لکھے نام پر اسے اپنے نام کا شبہ ہوا۔

''یسار عباد'' کے نام کا پلے کارڈ تھامے وہ لگ بھگ بیس بائیس سال کا لڑکا تھا اور اس کے پہلو میں انتہائی گوری چٹی اور اتنی ہی کپلوسی ایک لڑکی کھڑی تھی جو بمشکل پندرہ سولہ سال کی دکھائی دیتی تھی۔ بے بی پنک کلر کے موٹے اونی مفلر میں اس کے گال بھی ویسے ہی گلابی ہو رہے تھے۔ وہ متانت سے چلتا ان کے قریب آیا جو ابھی بھی گردنیں اچکا اچکا کر دوسری سمت دیکھ رہے تھے۔

''ایکسکیوز می۔ میرا نام یسار عباد ہے۔ میں کیلیفورنیا سے آیا ہوں۔''

اس نے ہلکا سا کھنکھار کے تعارف کروایا تو وہ دونوں چونک کر پلٹے۔ اس لڑکے نے چند پل اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور پھر بھرپور انداز میں آگے بڑھ کر اس کے گلے آ لگا۔ یسار کو ایسی گرم جوشی کی امید نہیں تھی، کچھ سیکنڈز وہ یونہی بے یقینی کی کیفیت میں گھرا رہا پھر اس نے بھی اپنے دونوں بازو اس کے گرد باندھ کر جوابی ردعمل دیا۔ اس دوران وہ لڑکی آنکھیں پھاڑے اسے بس دیکھے جا رہی تھی۔

''اپنا منہ بند کرو اور آنکھیں نارمل سائز میں لے آؤ ہنی۔ کارٹون لگ رہی ہو۔'' اس سے گلے مل کر وہ ہٹا تو اس نے ساتھ آئی لڑکی سے کہا۔ اس نے ساتھ ہی ایک چپت بھی اس کے سر کی پشت پر رسید کر دی تھی۔

''بائی داوے میرا نام رضا اور یہ میری چھوٹی بہن ہانیہ، جسے سب پیار سے ہنی بلاتے ہیں۔'' اس نے اپنے ساتھ بہن کا بھی تعارف کروایا۔ ہنی نے یک دم ویفرز کا پیکٹ رضا کے ہاتھ میں تھمایا اور اسی کی شرٹ کی فرنٹ پاکٹ سے پوائنٹر جھپٹا اور اس کی کیپ اتار کر ہاتھ کی ہتھیلی اور پین، دونوں ہی یسار کی جانب بڑھائے۔ وہ حیران سا آنکھوں میں سوال لیے اسے دیکھنے لگا۔

''پلیز آٹو گراف دے دیں۔ یقین مانیں۔ جب سے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے، میں نے اپنے پورے خاندان میں اتنا پیارا لڑکا نہیں دیکھا۔ سب کزنز کو دیکھ کر ہمیشہ ''فرط افسوس'' سے رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اللہ نے ایک ہی بھائی دیا۔ اس کو بھی شکل کے معاملے میں، میں نے ہمیشہ دس میں سے چار نمبر ہی دیے۔ اب آپ کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ آپ ہمارے ہی کزن ہیں۔ آپ آٹو گراف دیں گے تو میں اپنی سب فرینڈز کو دکھاؤں گی۔''

یسار عباد حیرت سے اس باتوں کی ''اے ٹی ایم'' مشین کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ رضا اپنی عزت افزائی پر اسے خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچھا بھلا

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

ہینڈسم نوجوان تھا وہ، پکڑ کر اپنی ہی بن نے مٹی پلید کر دی تھی۔ حیرت رفع ہوئی تو یسار نے دھیمے سے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا اور اس کے ہاتھ سے پین لے کر اس کی ہتھیلی پر چھوٹا سا سائن کر دیا۔ ہنی نے بچوں جیسی خوشی سے بھرپور مسکراہٹ لبوں پر سجائے اپنی ہتھیلی کو دیکھا اور پھر رضا کے ہاتھ سے پیکٹ واپس جھپٹ لیا۔

''گھر چلیں یسار بھائی۔ گھر میں بہت سے لوگ آپ کے شدت سے منتظر ہیں۔'' وہ بری طرح چونکا۔ آنے والے وقت کا سوچ کر ہی اس کی تمام سوچیں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔

گھر تک کے سفر میں وہ مسلسل خاموش رہا تھا۔ صرف ہنی اور رضا تمام راستے چونچیں لڑاتے آئے تھے۔ جن حالات کا وہ سامنا کرنے جا رہا تھا وہ خود میں اس کی سکت نہیں پاتا تھا مگر اس وقت وہ کسی کی آخری امید تھا۔ اور اسے اس امید پر پورا اترنا تھا۔

☆☆☆

یہ کیلیفورنیا کی دھند آلود صبح تھی۔ انتہائی دیدہ زیب سفید رنگ سے مزین رہائشی عمارت کو چاروں طرف سے بلند و بالا درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کڑاکے کی سردی میں سر پھرے جوان اس وسیع لان میں باسکٹ بال کی پریکٹس کر رہے تھے۔ دونوں ہی خوب لمبے تڑنگے تھے اور باسکٹ بال میں ان کی مہارت ان کی مشاقی کا ثبوت تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر باری باری سبقت لے جاتے تھے۔ داؤ کھیل کر اگر پہلا، دوسرے سے بال حاصل کر لیتا تو دوسرا نہایت پھرتی سے اسے واپس اچکتا اور اچھل کر باسکٹ کی نذر کر دیتا۔ دونوں کو تماشائیوں کی حاجت نہیں تھی کیونکہ ان کی اپنی چیخ پکار ہی کافی تھی۔

کھیل ختم ہونے پر وہ دونوں وہیں نم گھاس پر چت لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ دونوں کی نگاہوں کے سامنے دھند سے اٹا لامحدود آسمان تھا۔ وہ اسی طرح لیٹ کر ہمیشہ کچھ دیر خاموشی سے آسمان کو تکا کرتے تھے۔ بس انہیں ایسا کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اس وقت تک جب تک انہیں گھر کے اندر سے آرزو لودھی کی طرف سے بریک فاسٹ ریڈی ہونے کا سگنل نہیں مل جاتا تھا۔ ابھی بھی جیسے ہی ان کے کانوں میں آواز آئی، وہ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹتے، دھکے دیتے، گرانے کی کوشش کرتے اندر کو بھاگے۔ اسٹائلش اور دیدہ زیب کچن میں ملٹیلک گرے رنگ کی گول ٹیبل پر ناشتے کے تمام لوازمات چنے جا چکے تھے۔ کچن میں خاموشی کا راج تھا۔ آرزو کوکنگ رینج کے پاس کھڑی تھیں اور عباد لودھی منہ کے آگے اخبار بھی سجاتے تھے جب دونوں میں بات چیت مختصر وقفے کے لیے بند ہو جاتی تھی۔

یسار نے حسان کو کہنی مارتے ہوئے ابرو کے اشارے سے پوچھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

''کیا ہوا؟'' جواب میں حسان نے بھی تو لے کی زبان کو زحمت نہ دیتے ہوئے دونوں کندھوں کو اچکا دیا۔ آرزو بھی چائے کی کیتلی لیے چپ چاپ آ کر بیٹھ گئیں۔ بڑے سلیقے سے اپنے شوہر کے لیے سلائس پر بٹر لگا کر ان کے سامنے پلیٹ میں رکھا اور متوجہ کرنے کے لیے پاس پڑا فورک ان کی پلیٹ پر بجایا۔ عباد لودھی کا ہاتھ اخبار کے نیچے سے سلائس ٹٹولتا ہوا پلیٹ تک آیا اور اسے پکڑ کر جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس اخبار کے پیچھے غائب ہو گیا۔

یسار اور حسان نے ان کی اس حرکت پر بمشکل ہنسی روکی تھی جبکہ آرزو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ہاتھ گرم کیتلی پر لگا دیں۔ وہ مسلسل ناک سے تیز اور بھاری سانس چھوڑ کر اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

''کیا بابا! نیچے کریں یہ دیوار ورنہ ہم اسے گرا دیں گے۔'' یسار نے ماحول گمبھیر ہوتے دیکھا تو مذاقاً عباد لودھی کے ہاتھوں سے اخبار تھام کر سائیڈ پر رکھا اور انہیں آنکھوں سے اشارہ کیا۔

''ہاں۔ ہاں گرا دو، سب گرا دو مجھے۔ میں ہی تو ہوں وہ دیوار جو تم لوگوں کے آگے کھڑی ہے۔'' عباد لودھی غیر سنجیدگی سے بولے لیکن یسار اور حسان نے ایک ساتھ ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

''پلیز بڑے بابا۔ ایسا دوبارہ مت کہیے گا۔ آپ کو خود نہیں اندازہ آپ ہمارے لیے کیا ہیں۔'' حسان کی آنکھیں نم ہوئیں تو یسار اٹھا اور عباد لودھی کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

''بابا۔ آپ بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ آپ میں ہم سب کی جان ہے۔ ہم آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اس لیے آپ ہمیں ایموشنلی بلیک میل کرنے کی کوشش ترک کر دیں اور اچھے ہسبنڈ کی طرح ماما کی بات مان لیں۔''

عباد لودھی جو اپنا جذباتی وار کامیاب جانے پر خوش ہو رہے تھے یک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئے جبکہ آرزو کا چہرہ چمک اٹھا۔

''دیکھا۔ یہ ہے میرا بیٹا! اور اب آپ شرافت سے میری بات مانیں اور چلیں پندرہ دن کے لیے میرے ساتھ لاس اینجلس۔ غضب خدا کا! ایک ہی بچی ہے آپ کی، اس کے گھر کی پہلی خوشی، پہلا بچہ۔ کتنے شوق اور مان سے اس کے ساس سسر نے انویٹیشن دیا ہے اور آپ ہیں کہ نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔'' آرزو تیز تیز بولتی چلی گئیں، ہاتھوں میں بھی جان سی پڑ گئی جو اب تیزی سے مگوں میں چائے انڈیل رہی تھیں۔ حسان کو ساری بات اب سمجھ میں آئی تھی اور وہ آرزو ماما کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔

''یار آرزو! میں کروں گا کیا وہاں جا کر۔ تم تو اپنی بیٹی کی ناز برداریوں کے لیے اس کے روم میں ہو گی اور میں بے چارہ اس کے خبطی سسر کے پاس نہتا بیٹھا رہا کروں گا۔ قسم لے لو جو مجھے اس ''آئن سٹائن کے جرثومے'' کی باتیں سمجھ میں آتی ہوں۔ اوپر سے مجھ سے ملتے ہی پہلا فقرہ اس بندہ خدا کا یہی ہوتا ہے۔ ''آخاہ! اب آیا نا میرا مزاج شناس۔'' ہونہہ۔ پورے زمانہ طالب علمی سائنس سے بھاگ بھاگ کر پیروں میں آبلے پڑ گئے اور یہ جناب ہیں کہ مجھے اس عمر میں فزکس کی تھیوریز رٹانے کے درپے ہیں۔''

عباد صاحب کو بیٹی کے سسر سے اتنے شکوے تھے جتنے خود ان صاحب کی بیگم کو بھی نہ ہوں گے۔ وہ سائنس دان تھے۔ بات شروع ہی ریسرچ سے ہوتی اور ختم بھی جدید تھیوری پر کرتے۔

یسار اور حسان ہنس ہنس کر دہرے ہوئے جا رہے تھے اور آرزو تینوں کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ ان کا موڈ نئے سرے سے آف ہو گیا تھا۔ وہ واک آؤٹ کرنے ہی والی تھیں جب عباد صاحب نے انہیں بازو سے تھام کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ حسان اور یسار بھی سنجیدہ ہوتے ناشتے کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ناراض کیوں ہوتی ہو۔ مان تو گیا ہوں۔''

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

"ستر باتیں سنا کر مانے تو کیا فائدہ۔ عباد! آپ رشتوں کی نزاکت کو کب سمجھیں گے۔ پہلے ہی ہمارے پاس ان رشتوں کے نام پر بچا ہی کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کمر بھی ننگی اور پیٹ بھی۔" آرزو کا لہجہ بھیگ گیا، ان پر افسردگی طاری ہو رہی تھی۔

"آرزو ماما۔ آپ کیوں سوچتی ہیں ایسا۔ ہم سب ہیں نا آپ کے رشتے ناتے۔ کیوں یار؟" حسان نے آرزو کا ہاتھ محبت سے تھام کر یسار سے تائید چاہی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو ان کے چہرے پر بھی پھیکی سی مسکان ٹھہر گئی۔ عباد صاحب چمچ کو پلیٹ پر بجاتے ہوئے بولے۔

"چلو چلو۔ جلدی ناشتہ ختم کرو۔ میں اسٹور پر جا کر منیجر اور ورکرز کو کچھ ضروری انسٹرکشنز دے آؤں گا۔ ساتھ تم دونوں بھی چکر لگاتے رہنا۔ اب بیگم کو راضی رکھنے کے لیے یہ پل صراط تو پار کرنا پڑے گا۔"

اب ٹیبل پر ناشتے کے ساتھ ساتھ باتوں کا لامحدود سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اندر کچن کے ماحول میں رشتوں اور چاہت کی گرمی ہلکورے لے رہی تھی لیکن کھڑکی سے نظر آتا باہر کا منظر بے حد سرد اور دھند آلود تھا۔

☆☆☆

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ وہ سوچوں کے گرداب سے باہر نکل آیا۔ رضا ڈگی سے اس کا سامان نکالنے لگا جبکہ ہنی اتر کر اسے ویلکم کرنے کے انداز میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک تفصیلی نگاہ اس وسیع و عریض کوٹھی پر ڈالی جس کے پورچ میں اس وقت وہ لوگ موجود تھے۔ سامنے خوب صورت لان کے وسط میں فوارہ نصب تھا جس کا پانی دھوپ کی روشنی میں موتیوں کی لڑیاں پروتا بہہ رہا تھا۔

ایک پل کو اسے حیرت نے لپیٹ میں لے لیا کہ اس کی ماما کا میکہ اتنا عالی شان ہے۔ یہ وہ گھر تھا جہاں آرزو لودھی کا بچپن اور جوانی کے کئی سال گزرے تھے۔ اسے آرزو کا میکے کے لیے رونا اور کرلانا یاد آیا لیکن رضا کی آواز نے اس کا ارتکاز توڑ دیا۔ وہ اس کی معیت میں اندر کی جانب بڑھا۔ وہ گھر کی در و دیوار سے ٹپکتی امارت سے متاثر ہو رہا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا جھٹکا اسے اپنی نانی اور ممانی کو دیکھ کر لگا۔ وہ دونوں بے حد سادہ تھیں۔

اس کی نانی، زہرہ خاتون اس پر نگاہ پڑتے ہی بمشکل اس کی ممانی کے سہارے کھڑی ہوئیں۔ ان پر رقت طاری ہو رہی تھی اور پھر جیسے ہی یسار ان کے گلے لگا، وہ اسے سینے سے لپٹائے بری طرح سے رو دیں۔ ان کا بوڑھا وجود کپکپانے لگا۔ وہ بار بار "میری آرزو، میری آرزو" کہہ کر اس کا چہرہ اور ہاتھ چومتی تھیں۔ ان کے قریب کھڑی خاتون جو اس کی ممانی تھیں، وہ بھی اس سے بے حد محبت اور اپنائیت سے ملیں۔ وہ غضب کی حسین تھیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر سادہ۔ سادہ لباس میں گرے رنگ کی چادر اوڑھے وہ بہت باوقار لگ رہی تھیں۔

کھانے میں ابھی وقت تھا مگر پھر بھی ممانی نے اس سے پوچھا تھا، وہ صاف انکار کر گیا کیونکہ اول تو فلائٹ میں ہی اس نے ہلکا پھلکا لے لیا تھا۔ دوسرا یہاں آتے ہی اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا اس لیے وہ جلد از جلد اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا مگر زہرہ خاتون کے کہنے پر ملازمہ نے جھٹ پٹ چائے اور لوازمات چن دیے، اسے مجبوراً تھوڑا بہت لینا پڑا۔

اس دوران ہنی اور رضا مسلسل باتیں کرتے رہے — اور وہ مقدور بھر جواب بھی دے رہا تھا۔ جب باتوں باتوں میں ہی تین ماہ پہلے ماموں کے گزر جانے کا ذکر ہوا تو وہ یک دم چپ سا کر گیا۔ سارے ماحول پر سوگواری سی چھا گئی۔ زہرہ خاتون کی بوڑھی آنکھیں جوان بیٹے کے غم سے بوجھل ہو گئیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے زہرہ خاتون نے نہ جانے کیا اخذ کیا کہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

"ابھی تھکے ہوئے آئے ہو۔ کچھ بھی مت

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

سوچو۔ بڑا وقت پڑا ہے ان گتھیوں کو سلجھانے کا۔ ابھی آرام کرو۔"

ممانی نے رضا کو اسے کمرہ دکھانے کو کہا تو وہ خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کانوں میں زہرہ خاتون کی آواز آئی تھی، وہ ممانی سے کہہ رہی تھیں۔

"اپنے داجی کو بھی بتا دو فاطمہ کہ ان کا نواسا آیا ہے، تاکہ وہ اس سے ملیں تو ان کے اعصاب پر کہیں یہ سب بھاری نہ گزرے۔"

اور وہ تو یکسر بھول ہی گیا تھا کہ اس گھر میں اس کے نانا بھی ہیں۔ وہی جن کی وجہ سے اسے پاکستان آتے ہوئے جھجک سی تھی۔ جن کا جاہ و جلال آج بھی پردیس بیٹھی آرزو کو ٹھٹرا دیتا تھا۔

اس کے نانا ایک سخت گیر اور دبنگ شخصیت۔ "خان اللہ یار خان۔"

☆☆☆

زینیا، عباد لودھی اور آرزو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ لاس اینجلس میں رہائش پذیر اچھی پاکستانی فیملی میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے تین برس بعد اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ آرزو کے تو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے، خوش عباد صاحب بھی بے حد تھے مگر مردوں کے اظہار کے انداز اور ہوتے ہیں۔

وہ اتنے دن کے لیے بیٹی کے سسرال جا کر رہنے کو بالکل بھی راضی نہیں تھے مگر ان لوگوں کے بے حد اصرار اور آرزو کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلے گئے تھے۔ آج دو دن ہو گئے تھے انہیں گئے ہوئے اور گھر میں یسار اور حسان کی موجیں لگی ہوئی تھیں۔ آرزو ان دونوں کا من پسند بنا کر فریز کر گئی تھیں مگر۔ ہر روز جاب سے واپسی پر دونوں ایپرن پہنے کچن میں پائے جاتے اور بقول حسان کے ایسے ایسے بے ہودہ ذائقے یہ دونوں دریافت کر چکے تھے کہ یہ ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

یقیناً آرزو اپنے اتنے خوب صورت کچن کی حالت دیکھ لیتیں تو غش کھا جاتیں، گرنا فرض ہو جاتا۔

آج بھی دونوں اسٹیک بنانے کے لیے گوشت کے پارچوں اور مسالا جات سے نبرد آزما تھے مگر یہی پلے نہیں پڑ رہا تھا کہ گوشت کو مسالا پہلے لگانا ہے یا گرل پہلے کرنا ہے۔

"ویسے سانی۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں نہ ہوتا تو تمہارا کیا بنتا۔" یسار نے گوشت پر مسٹرڈ پیسٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری غلط فہمی ہے یار۔ تو ہے تب ہی تو میرا کچھ بن نہیں رہا۔ کمینے۔" حسان نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے پین میں اولیو آئل ڈالا۔ یسار نے ہاتھ میں تھامے چمٹے سے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔

"شکل دیکھی ہے اپنی۔ میں تیرے ساتھ چلتا ہوں تو چار لڑکیاں مڑ کر دیکھ لیتی ہیں۔ تین میری طرف اور ایک تیری طرف، ورنہ تو تجھے دیکھ کر لڑکیوں کے منہ سے ہڈی اور برو کے علاوہ تیسرا لفظ ہی نہیں نکلتا۔ ایویں تو نہیں جیری تجھے چھوڑ کر میرے پیچھے چلی آتی تھی۔" میرینیٹڈ پارچوں کو پین میں رکھتے ہوئے یسار نے بڑے فخر سے کہا تھا، جواباً حسان دونوں ابرو اچکاتے ہوئے اسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے بولا۔

"او ہیلو۔ وہ جیری کی بچی میرے ہی پیچھے تھی اور اس بات کی گواہ آدھی یونی تھی۔ میں نے لفٹ نہیں کرائی تب جا کر اس نے تجھے گھاس ڈالی۔"

یونیورسٹی لائف میں جینیفر نامی لڑکی حسان پر بری طرح لٹو تھی مگر حسان کو وہ زہر لگتی تھی۔ جیری نے بڑی کوشش کی حسان کو لائن پر لانے کی مگر وہ اس کے ہاتھ آ کے نہیں دیا، تب کہیں جا کر اس نے یسار کو لفٹ کرائی اور چار دن دوستی چلا کر یہ جا وہ جا۔ کیونکہ اس کی جو ڈیمانڈز تھیں وہ نہ تو یسار کی تربیت تھی نہ فطرت لہٰذا جیری بددل ہو کر اسے کچھ ہی دن میں چھوڑ چھاڑ گئی۔ مگر دونوں پریکٹیکل لائف میں آنے کے باوجود ایک دوسرے کو اس کے نام سے چھیڑتے تھے۔

"ہا.....! شٹ۔ میں یعنی کہ یسار عباد ایک لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا۔ اف.....!

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

میرے کریڈٹ پر ایسی شرمندگی۔ بس! مجھے جینے کا کوئی حق نہیں، مجھے یہ دو نمبر دنیا چھوڑ جانا چاہیے۔ سوچ رہا ہوں مر جاؤں اب۔"

وہ مصنوعی بے چارگی طاری کیے مسلسل بک بک کر رہا تھا جب یک دم حسان طیش سے آگے بڑھا اور اسٹوو پر رکھے پین کو اٹھایا اور کچن کی ونڈو سے باہر کمپاؤنڈ میں اچھال دیا۔ ساتھ والے ہمسائے مارک کا کتا بڈی بھاگتا ہوا آیا اور ادھ پکے اسٹیک پر منہ مارنے لگا۔ یسار ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ حسان کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پیٹھ موڑے کھڑے حسان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور یسار کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

"تجھے پتا ہے نا تو میرے لیے کیا ہے۔ پھر بھی، پھر بھی ایسی بکواس کی۔ اس پوری دنیا میں یسار سے بڑھ کر حسان کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اس کی اپنی زندگی بھی نہیں۔ آئندہ اگر ایسی بات منہ سے نکالی تو میں تیرا منہ توڑ ڈالوں گا یار۔" وہ ہمیشہ سے یسار کو یار بلانے کا عادی تھا مگر وہ اس حد تک اسے اہم جانتا تھا یہ یسار کو آج معلوم ہوا تھا۔ اس کی اتنی محبت پر آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس نے بھرپور گرم جوشی کے ساتھ اسے سینے سے لگا لیا۔

"چل۔ چل۔ زیادہ سینٹی نا ہو۔ مجھے ایسے لوگ مینٹل لگتے ہیں۔ سمجھا۔" یسار نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے مذاقاً کہا۔ ساتھ ہی سر کھجاتے ہوئے حسان کو کن اکھیوں سے دیکھا اور چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا۔

"اور اب تو میری محبت میں اتنا اندھا ہو ہی رہا ہے تو کل مجھے اپنے نئے اسٹیکرز دے دے۔ قسم سے چار پانچ گھنٹے میں واپس کر دوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں کبھی بھی تیری محبت میں اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ تجھے اپنے اتنے قیمتی اسٹیکرز دے دوں۔" حسان نے فوراً واپس کاؤنٹر کی طرف منہ پھیرا اور آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لے۔ کل کو میں بھی تیرے کام آؤں گا۔ اوفیلیا نے اپنی برتھ ڈے پر انوائیٹ کیا ہے مجھے۔ صرف چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ دے دے نا۔"

"ہرگز نہیں۔ چھٹی کر۔ پچھلی دفعہ اتنا مہنگا کوٹ برباد کر آیا تھا۔ کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا جو بیچ پر کوٹ پہن کر جائے۔"

"وہ..... وہ تو کوئی ایونٹ ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں تیرا کوٹ پہن پاتا اس لیے سوچا بیچ پر ہی سہی۔"

"ایک نمبر کا کمینہ انسان ہے تو۔ چل شاباش کوئی نہیں دینے میں نے اسٹیکرز۔ تجھے دینے سے بہتر ہے میں انہیں رولر کے نیچے دے دوں۔ بلٹ ٹرین کے ٹریک پر دے دوں بلکہ یہ ساتھ والے مارک کو دے دوں۔ پر تجھے نہیں دوں گا۔" حسان نے اسے چڑانے کی حد کر دی۔ یسار نے تاؤ کھاتے ہوئے پانی سے بھرا جگ حسان کے اوپر اچھال دیا۔ وہ اس افتاد کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا سو کچھ پل تو بے یقینی سے اپنے گیلے وجود اور کچن فلور پر پھیلے پانی کو دیکھتا رہا اور پھر جیسے غدر ہی مچ گیا۔ دونوں کے جو ہاتھ آیا، ایک دوسرے پر اچھال مارا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کچن کی ابتر ہوتی حالت ان کے بس سے باہر ہو رہی تھی اور انہیں بعد میں اسے سمیٹتے دانتوں پسینہ آنے والا ہے۔ کچن کی کھڑکی سے باہر کھڑے ہو کر اس منظر پر نگاہ ڈالو تو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ان نوجوانوں پر خود زندگی کو رشک آ جائے۔ مگر جب زندگی رک جائے تو.....

☆☆☆

وہ نہ جانے کتنی دیر سویا تھا کیونکہ جس وقت وہ نہا کر بیڈ پر لیٹا تھا تو کھڑکی کے پار ڈھلتے سورج کی روشنی ابھی باقی تھی مگر اب جب آنکھ کھلی تو یکسر تاریکی۔ اس کا کمرہ بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ٹٹول کر سائیڈ ٹیبل سے لیمپ کا بٹن ڈھونڈا اور اسے آن کر دیا۔ ہلکی زرد روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی۔ سامنے وال کلاک لگا تھا، رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ کافی دیر سویا تھا اور اب اسے بھوک

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن کمرے سے باہر جانے سے پہلے اس نے سیل فون نکالا اور کیلیفورنیا کال ملائی۔ وہاں دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ سا بات کر رہا تھا، یقیناً وہاں اس کے دیر سے کال کرنے پر پریشانی ہو رہی تھی۔ ایک دو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے آرزو کا حال پوچھا اور پھر مایوس سا آنکھیں مسلنے لگا۔ کال ختم ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ بیڈ کے بالکل سامنے ڈریسنگ ٹیبل تھی اور وہاں تمام ضروری لوازمات پڑے تھے۔ اس نے بالوں میں برش کیا، چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہی دائیں جانب ڈائننگ ہال تھا، لاؤنج میں بیٹھی ہنی نے شور مچا مچا کر سب کو اکٹھا کر لیا تھا۔

''قسم سے یسار بھائی۔ پیٹ میں میرا تھن ریس لگی ہے۔ اوپر سے ماما نے دیسی، بدیسی پانچ ڈشز بنائی ہیں لیکن آپ تھے کہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔''

اس کی تیز تیز چلتی زبان کو فاطمہ ممانی کی چپت نے بند کیا تھا۔ وہ نفاست اور سلیقے سے سجی سلاد کی ڈش لے کر کچن سے باہر نکلی تھیں۔

''اس کو فضول کھانے کی اور بک بک کرنے کی عادت ہے بیٹا۔ آپ برا نہ ماننا۔ بس سن لیا کرو۔ چلو آؤ۔ آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔'' وہ رسان سے کہتی اس کا بازو محبت سے تھام کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھیں۔ یسار ان کے اس اپنائیت بھرے انداز پر دل ہی دل میں شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا اور اسے ان کی سادگی پر حیرت بھی تھی۔ وہ اس سے یوں مخاطب تھیں جیسے ہمیشہ سے وہ یہاں رہتا رہا ہو حالانکہ اپنی چوبیس سالہ زندگی میں وہ پہلی بار پاکستان آیا تھا۔

وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تو سامنے سے ہنی، زہرہ خاتون کا ہاتھ تھامے انہیں وہیں لیے چلی آئی۔ وہ احتراماً کھڑا ہو گیا، انہوں نے فوراً اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کھانا شروع کرو یسار بیٹا۔ آپ بھی ڈالیں ادے۔'' ممانی نے بھاپ اڑاتے پلاؤ کی ڈش زہرہ خاتون کے آگے کی۔ لیکن انہوں نے بڑی محبت سے پہلے یسار کی پلیٹ کو بھرا۔ اس کی طرف گاہے بگاہے دیکھتے ان کی نظریں بھیگ رہی تھیں۔

''فاطمہ۔ بیٹا! سلسبیل کہاں ہے۔ اسے بھی بلواؤ۔ ہزار بار کہا ہے اس لڑکی سے کہ رات کے کھانے پر تو کم از کم بنا بلاوے کے آ جایا کرے مگر اس کی بھی اپنی ہی من مانیاں ہیں۔'' سلسبیل کا نام سنتے ہی اس کے سارے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ غائبانہ تعارف سب سے زیادہ اسی ہستی سے تو تھا۔ ''اللہ جانے سامنے آ کر کیسے ری ایکٹ کرتی ہے۔'' یسار نے دل میں سوچا۔

وہ غائب دماغی سے لقمے لیتا سوچے جا رہا تھا جب اس کے بالکل سامنے والی چیئر پر ہنی کے پہلو میں جیسے کوئی اپسرا آ بیٹھی تھی۔ وہ چند پل ہاتھ روک کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ آنے والی نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ غضب کی بے نیازی تھی۔ زہرہ خاتون نے ناگواری سے اسے گھورا مگر لہجہ ملائم رکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''سلسبیل بیٹا۔ آپ اپنی پھپھو کے بیٹے سے نہیں ملیں۔''

پھر وہ یسار سے مخاطب ہوئیں۔ ''یسار بیٹا یہ سلسبیل ہے، تمہارے ماموں کی سب سے بڑی بیٹی۔ سارا دن کالج میں لڑکیوں کے ساتھ مغز ماری کرتی ہے اور گھر آ کر اپنے اسٹوڈیو میں گھس جاتی ہے جہاں رنگوں سے الجھتی رہتی ہے۔'' اس قدر تفصیلی تعارف پر جہاں یسار کی آنکھوں میں دلچسپی کا تاثر ابھرا تھا وہیں سلسبیل کے ماتھے پر ناگواری سے شکن نمودار ہوئی تھی۔ ہنی منہ چلاتے ہوئے بیچ میں کودی۔

''اصل میں یسار بھائی۔ ہماری آپی خود جتنی خوب صورت ہیں نا، ان کا مزاج اتنا ہی تیکھا ہے۔ انہیں لوگوں سے گھلنا ملنا ذرا پسند نہیں ہے۔ اس لیے

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

ان کے حصے کا میں ہی مل ملا لیتی ہوں سب سے۔" وہ اپنی بات پر خود ہی قہقہہ مارتی محظوظ ہوئی۔ زہرہ خاتون بھی ہنس دیں۔ ممانی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"تم منہ بند کر کے کھانا کھاؤ اور سونے سے پہلے سب کو دودھ کے گلاس دینے ہیں تم نے۔ اپنی آپی کو بھی۔" انہوں نے اسے رات کی ڈیوٹی یاد کرائی۔

"نہیں ماما۔ میں نہیں پیوں گی۔ میری طبیعت بوجھل ہے۔ رضا کہاں ہے؟" اس نے انکار کرتے ہوئے رضا کی بابت پوچھ کر موضوع سے دھیان ہٹایا تھا۔ یسار کو وہ بالکل نظر انداز کر گئی تھی۔

"رضا تمہارے دادی کو کھانا کھلا رہا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔" جواب زہرہ خاتون نے دیا تھا اور ساتھ ہی یسار پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

شاید انہیں یسار کو اس کے نانا سے ملوانا مشکل مرحلہ لگ رہا تھا۔ وہ خود بھی کچھ متذبذب تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے سلسبیل کو دیکھا اور جی جان سے اس خاندان کی خوبصورتی کا قائل ہو گیا۔ اس کی ماما آرزو سے لے کر یہاں ہر ایک حسن و جمال میں بے مثال تھا۔ وہ خود بھی بے حد ہینڈسم تھا، اس کا قد، کسرتی جسم اور شفاف رنگت پر دل کش نین نقش نظر انداز کیے جانے والے نہیں تھے مگر رضا کی بھی مردانہ وجاہت سر چڑھ کر بولتی تھی۔

فاطمہ ممانی اس عمر میں بھی غضب ڈھاتی تھیں، کہیں سے بھی وہ تین جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی تھیں، جبکہ وہ بلا کی سادہ تھیں۔ اس کی نانی پر کسی ریاست کی ملکہ کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں سب انہیں "انیہ بی" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ یک دم اس کے دل میں نانا کو دیکھنے کی خواہش جاگی۔ کیسا ہوگا وہ جاہ و حشمت کا کوہ، جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے ریزہ ریزہ ہو گئے۔

چمچوں کی کھنکھناہٹ سے اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ سب کھانا کھا چکے تھے، اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

سلسبیل کب کی وہاں سے جا چکی تھی۔ فاطمہ ممانی، ملازمہ کے ساتھ برتن اٹھوا رہی تھیں۔ ہنی بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ ٹیبل پر اب صرف وہ اور زہرہ خاتون تھے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ فکر مند اور سوچوں میں غلطاں۔ وہ خود کو "خان اللہ یار خان" سے ملنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

☆☆☆

"تجھے کیا لگتا ہے کہ انسان کی شادی کی بہترین عمر کون سی ہے سانی۔" وہ دونوں ہاتھوں کو سر کی پشت پر باندھے، لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے حسان سے پوچھ رہا تھا۔ حسان نے ایک پل کو اپنے موبائل سے نظریں ہٹا کر یسار کو دیکھا اور لاپروائی سے بولا۔

"جب اس کے دودھ کے دانت ٹوٹ جائیں۔"

"بکواس نہ کراوئے۔ وہ تو آٹھ نو سال کی عمر میں ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"اچھا تو جب اس کی عقل داڑھیں نکل آئیں۔"

"یہ اس سے بھی بڑی چول ماری تم نے۔ بابا کی ایک بھی عقل داڑھ نہیں ہے۔ بقول ان کے۔"

"تو پھر جا میرا سر نہ کھا اور جا کے نکاح پڑھوا لے کیونکہ جب شادی کا ہڑکا لگ جائے تو کروا لینی چاہیے۔" حسان کے دوٹوک کہنے پر یسار کھسیانا سا ہو کر ہنس دیا۔

"اچھا تو یہ بتا کہ بندے کو شادی ننھیال میں کرنی چاہیے یا ددھیال میں۔"

"ایڈیٹ۔" حسان نے پاؤں کے پاس پڑا فٹ بال یک دم یسار کی طرف اچھال دیا جسے اس نے کمال مہارت سے کیچ کر لیا۔

"ددھیال میں تو تیرا صرف میں ہی اکلوتا کزن ہوں۔ تو نے کہاں کرانی ہے شادی؟ اور اگر کوئی دور پار کی ہماری پھوپھیوں اور چچاؤں کے بچے ہیں بھی تو وہ یا تو گودی والے ہیں یا پھر ان کی اپنی گود میں بچے ہیں۔ اب بچی تیری ننھیال، تو یار! شرافت سے

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

بک دے کہ کیا سین ہے۔ کس کو پٹایا ہے؟''

''کسی کو نہیں پٹایا منحوس انسان۔'' یسار خجل سا ہو کر چڑتے ہوئے بولا۔

''میں تو ویسے ہی سوچ رہا تھا کہ شادی تو کرنی ہے تو کیا حرج ہے اگر ماموں کے ہاں کروالوں۔ اس طرح ماما اپنے گھر والوں کے قریب ہو جائیں گی۔ ان کا دکھ دور ہو جائے گا۔''

''آہاہاہا..... اتنے تم ماما کے ہمدرد۔ یار! سیدھی طرح بتادے، کیا معاملہ ہے ورنہ معلوم تو مجھے ہو ہی جائے گا لیکن اس کے بعد میں تیری گردن بھی مروڑوں گا۔ سمجھا!''

''اسفند ماموں کی بڑی بیٹی ہے۔ وہ بس ذرا سی اچھی لگی ہے مجھے۔ اس کے علاوہ کوئی سین نہیں۔''

حسان موبائل چھوڑ چھاڑ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ناچ رہی تھی۔

''آر یو سیریس؟ کیا واقعی یار؟ کیا وہ بھی تم میں انٹرسٹڈ ہے۔''

''نہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سرسری سی بات چیت ہوئی ہے۔ اس کا انداز بہت دوٹوک اور سنجیدہ ہے۔ میں اس سے ایسی کوئی بات نہیں کر سکا اب تک۔''

''تو پھر۔ تو پھر کیا ہے تم دونوں کے بیچ۔ اور تم اس تک پہنچے کیسے؟''

''سوشل میڈیا یار۔ اور کیا۔ اب یہاں سرچ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ اسفند ماموں کا اکاؤنٹ اوپن کیا تھا، وہیں سے اسے اپروچ کیا۔''

''تو تم نے جب خود کو انٹروڈیوس کروایا تب اس کا ری ایکشن؟''

''بالکل نارمل۔ جیسے اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ لیکن وہ مجھے آہستہ آہستہ اچھی لگنے لگی۔ اور یہ بات میں نے اس سے کہہ بھی ڈالی۔''

''اوہ خدایا۔ کتنا تیز ہے تو یار۔ اور اس نے کیا کہا آگے سے؟''

''کچھ بھی نہیں، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ میں بھی اسے برا نہیں لگا، وہ بھلے کھل کر اظہار نہ کرے مگر میرا انتظار کرتی ہے۔ میں ایک بھی دن آن لائن نہ آسکوں تو اس کے میسج آئے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب تو تم بھی سمجھتے ہو گے؟'' یسار نے استفہامیہ مگر شرارتی نظروں سے حسان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور تم گھونچو مجھے اب بتا رہے ہو۔ اگر پہلے بتا دیتے تو میں بابا سے بات کر لیتا، وہ خود ہی اس مسئلے کا حل نکال چکے ہوتے اب تک۔''

حسان تاسف سے یسار کو دیکھتے ہوئے بولا جس کے چہرے پر محبت کی چمک پھیلی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے حسان کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی مدد سے دل بنا کر دکھایا اور پھر سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کے کھو جانے کا اشارہ کیا۔ اسے پیار ہو گیا تھا، اس کا پورا وجود اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ حسان نے ایک بار پھر بال ہاتھ میں اٹھا کر ہوا میں اچھالا اور پوری قوت سے اسے پنچ مار کر یسار کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے مہارت سے کیچ کر لیا۔ کمرے میں یسار کے شرارتی قہقہے پھوٹنے لگے۔

☆☆☆

وہ زہرہ خاتون کے ساتھ آہستہ روی سے چلتا کاریڈور سے گزر رہا تھا جس کے سرے پر دو بیڈ رومز کے بند دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک پل کو تو اس کا دل چاہا یہیں سے واپس ہو لے۔ اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی مگر سامنا تو کرنا ہی تھا۔ زہرہ خاتون نے دائیں طرف والے بیڈروم کے دروازے کے باہر ذرا توقف کیا اور — بے حد نرمی اور محبت سے بولیں۔

''یسار۔ بیٹا! تمہارے داجی کو اسفند کی وفات کے بعد فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ علاج معالجے کے بعد بات چیت کے قابل تو ہو چکے ہیں مگر چل پھر نہیں سکتے۔ قویٰ بھی کمزور ہو چکے ہیں اس لیے اگر کچھ گرم سرد کہیں تو برداشت کر لینا۔ چند دن لگیں گے انہیں تم

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

سے مانوس ہونے میں مگر بیٹا تم مایوس نہ ہونا۔ تم ہی وہ واحد راستہ ہو جو میری آرزو کو دوبارہ اس گھر کی دہلیز پر لا سکتا ہے۔"

ان کی جھلملاتی آنکھوں کو دیکھ کر یسار نے ایک لمبا سانس اندر کھینچا اور ان کا ہاتھ تھپتھپا کر دلاسا دیا۔ اس کے ساتھ ہی زہرہ خاتون اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو گئیں۔

بے حد کشادہ بیڈروم کے بیچوں بیچ بیڈ پر اس کے نانا خان اللہ یار خان دراز تھے۔ رضا انہیں کھانا کھلا چکا تھا اور ان کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی دوائیں چیک کر رہا تھا۔ ان دونوں کے اندر داخل ہونے پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ اس نے ۔ جوابی مسکراہٹ کا تبادلہ کرنے کے بعد بیڈ کی طرف نگاہ کی۔ لحیم شحیم جسامت، سرخ و سفید رنگت پر برف جیسے سفید، بالکل سیدھے بال اور داڑھی۔ موٹی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اور بھرے بھرے ابرو جو آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اونچی ناک اور گلابی لب۔ ماتھے پر شکنوں کا جال۔ یہ تھے خان اللہ یار خان۔

اسے وہ پہلی ہی نظر میں بہت متاثر کن لگے۔ ان کی شخصیت کا رعب اس قدر تھا کہ اسے اپنی ہتھیلیاں پسیجتی محسوس ہوئیں۔ انہیں اس کے آنے کی خبر دی جا چکی تھی اور اب جیسے انہوں نے اس پر نگاہیں گاڑ ہی لی تھیں۔ زہرہ خاتون کے اشارے پر وہ چلتا ہوا ان کے قریب گیا اور ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور رخ پھیر لیا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور وہیں قریب دھری کرسی پر ٹک گیا۔

"میں یسار عباد ہوں نانا جان۔ میرا مطلب "داجی۔ آرزو عباد کا بیٹا۔" اس نے سب کو انہیں داجی" بلاتے سنا تھا، سو خود بھی اسی نام سے پکارا۔

"میں کسی آرزو عباد کو نہیں جانتا۔ آرزو خان کو جانتا تھا مگر ستائیس سال پہلے وہ مر چکی۔"

اپنی بات کے جواب میں اسے کم و بیش ایسے ہی فقرے کی امید تھی پھر بھی دل دکھا تھا۔ رضا اور زہرہ خاتون کے چہرے پر بھی تکلیف ابھری۔ اس نے ضبط اور جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی ماں کا مقدمہ لڑنے آیا ہوں داجی۔ اور زندہ لوگوں کے آگے صرف زندوں کی صفائی دی جاتی ہے۔ مرے ہوؤں کو تو اللہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔"

"مجھے کسی سے کچھ نہیں سننا۔ مجھے اگر اپنے فیصلے پر افسوس ہوتا تو میں بہت پہلے ہی اس گھر کے دروازے اس پر کھول چکا ہوتا۔"

"آپ کو افسوس ہے داجی۔ میرا اس گھر کی دہلیز پار کر کے آپ کے کمرے میں آپ کے روبرو ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اپنی بیٹی کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔"

اس نے لوہا گرم دیکھ کر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ خان صاحب کا چہرہ پل بھر میں انگارہ ہو گیا۔ وہ جلبلا کر بولے۔

"میں دل میں نرم گوشے صرف قبروں کے لیے بناتا ہوں جس میں، میں ہر اس شے کو دفنا دیتا ہوں جو میرے اصولوں سے ٹکرائے۔"

"وہ شے نہیں ہیں۔ آپ کی بیٹی ہیں۔ آپ ان کو کب تک زندہ درگور کیے رکھیں گے؟"

"میں نے کہا نا۔ وہ مر چکی۔ اور میرے دل میں اس کی قبر اتنی گہری ہے جہاں سے اس کی کوئی سسکی، کوئی فریاد دل کی دیواروں سے لپٹ نہیں پاتی۔"

"وہ ستائیس سال پہلے نہیں مری تھیں نانا جان۔ ہاں اب کے جو میں نامراد لوٹا تو آپ کو ان کے مرنے ہی کی خبر ملے گی۔"

وہ سپاٹ اور ٹھوس انداز میں کہتا، مضبوط چال چلتا کمرے سے نکل گیا۔ پیچھے زہرہ خاتون آنکھوں میں آنسو لیے دل تھام کر بیٹھی تھیں۔ رضا نے ان کو کندھوں سے تھام لیا جبکہ آدھا بے جان دھڑ لیے کروفر سے اپنے بیڈ پر دراز خان اللہ یار خان کے چہرے کے تاثرات ابھی بھی مفلوج تھے۔

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

☆☆☆

''تیرے پاس وہ ہے؟'' یسار نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے حسان سے سوال کیا۔

''کیا؟''

''وہ یار۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے۔''

''جوتا کہتے ہیں۔ جو میں تیرے دماغ پر برساؤں گا۔ یادداشت کی بحالی کے لیے۔''

''نہیں۔ نہیں یاد آ گیا۔ وہ ذرا اپنا ''ون ملین'' پرفیوم تو دینا۔ قسم سے ایک اسپرے کروں گا اور بس۔''

''خبردار، جو میرے پرفیوم کو سونگھنے کی بھی کوشش کی۔ لگانا تو دور کی بات۔''

''یار سانی۔ تو اپنے یار کو پرفیوم کا ایک اسپرے نہیں کرنے دے سکتا۔ اگر وہ ''ون ملین'' میرا ہوتا تو میں تجھے نہلا دیتا اس میں۔'' یسار نے ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے جذباتی وار کیا لیکن حسان پر رتی اثر نہیں ہوا تھا۔

''ہیو گو باس اور ورساچی کو تو نے ——— آخری بوند تک ایسے پروں میں چھپائے رکھا جیسے وہ تیرے انڈے ہوں اور تو ان کی مرغی امی۔ لہٰذا بھول جا بیٹا کہ میرے پاس کوئی پرفیوم ہے۔ اپنا باڈی اسپرے لگا اور چل اب۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔''

ان کا آفیشل گیٹ ٹو گیدر تھا آج۔ حسان تو کب سے تیار ہوا بیٹھا تھا مگر یسار کی تیاری ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے تو اب باقاعدہ نیند آنے لگی تھی۔

''بائی داوے۔ تم اتنا تیار کس لیے ہو رہے ہو۔ کیا ماموں کی بیٹی کو تصویر بھیجنی ہے؟'' حسان نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سانی۔ نہ میں نے اپنی کوئی تصویر اسے بھیجی ہے نہ اس کی مانگی ہے۔ اب ایک ہی دفعہ پاکستان جا کر روبرو ہوں گے ہم۔''

''اور وہ جو تیرا پروفائل بھرا پڑا ہے پکچرز سے۔ وہ؟''

''میں نے اس سے کانٹیکٹ کرنے کے لیے نئی آئی ڈی بنائی تھی۔ اسی پر بات ہوتی ہے اور اس پر میں نے اپنی کوئی پک اپلوڈ نہیں کی کبھی۔''

''واللہ۔ مجھے ذرا اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے ہوشیار ہو۔ ورنہ تمہارا مرید ہوتا۔''

''تو اب ہو جا۔ اور مجھے سب سے پہلا نذرانہ اپنا پرفیوم دے دے۔''

''مر کے بھی نہیں۔ سمجھا۔'' حسان نے انگلی اٹھا کے متنبہ کیا۔

''ابے یار۔ مر گیا تو مجھ پر گلاب کا عطر ڈالنا۔ کیمفر (کافور) چھڑکنا۔ بھلا مردے کا اتنے مہنگے پرفیوم سے کیا واسطہ۔''

بے تکان بولتا یسار ہیئر برش رکھ کے پلٹا ہی تھا جب اس نے زوردار چھناکے کی آواز سنی۔ حسان کا فیورٹ اور مہنگا ترین پرفیوم کرچی کرچی ہوا اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

''بولا تھا نا کہ مجھ سے اپنے مرنے کی بات کرنا کبھی۔ بولا تھا نا۔'' خون رنگ آنکھیں لیے حسان کہہ رہا تھا اور یسار ہکا بکا سا کبھی فرش کو تو کبھی اس کو دیکھ رہا تھا۔ چند پل یونہی گزر گئے اور پھر یک دم یسار آگے بڑھا اور اسے بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ وہ ایک بار پھر جذباتی ہیجان کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی پیٹھ کچھ دیر سہلانے کے بعد یسار اس سے الگ ہوا اور بولا۔

''سانی۔ تو پچھلے کچھ عرصے سے میرے لیے زیادہ ہی پٹی نہیں ہو گیا۔ تیرے اندر کیسا وہم ہے، آج مجھے بتا دے!''

''وہم نہیں ہے مجھے۔ بس تو مجھ سے اپنے مرنے کی بات مذاق میں بھی نہ کیا کر۔ میرا دل رکنے لگتا ہے۔ میری زندگی میں رشتوں کی بہت کمی ہے یار۔ اور جو ہیں ان میں تو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

اس کے بے حد سنجیدگی سے جواب دینے پر یسار نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی اور دل گیر لہجے

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

میں کہا۔

''کاش تو میرے ماموں کی بیٹی ہوتا۔''

''کمینہ۔'' حسان نے اس کے سینے پر مکا جڑا۔

وہ سمجھا تھا نہ جانے کیا بولنے والا ہے وہ۔

''اور یہ جو اتنا قیمتی پرفیوم توڑ ڈالا ہے۔ وہ؟ بس میرے کام نہ آنا کبھی۔ بھلا بتاؤ اس مظلوم کو پہلے مجھ پر دو بار پھس پھس تو کر لیتے۔ پر نہیں تجھے تو ہر وقت شعلے قلم کا ویرو بننا آتا ہے۔''

''اور تو بسنتی کی طرح نخرے کیے جایا کر۔''

''ابے چل۔ بسنتی کیوں ہونے لگا میں۔ وہ تو پاکستان میں بیٹھی ہے۔ میری بسنتی۔''

''ویسے۔'' یسار نے فوراً آگے ہو کر اس کا ہاتھ تھاما اور رسان سے بولا۔ ''سانی اگر کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ میں ماما کے گھر والوں کو ان سے ملانے میں ناکام ہو جاتا ہوں تو پلیز۔ پلیز وعدہ کرو کہ تم یہ کام کرو گے؟''

''تم پھر سے بکواس کرنے لگے ہو۔'' حسان نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

''نہیں سانی۔ آئی ایم سیریس۔ یار ماما کو میں نے اپنے بچپن سے چھپ چھپ کے روتے دیکھا ہے۔ تب سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جوں جوں میں اور زینیا آپی بڑے ہوتے گئے، ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ماما کے گھر والوں کو پرابلم کیا ہے مگر کبھی بھی کھل کر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''ہاں۔ کچھ کچھ آئیڈیا تو مجھے بھی ہے یار مگر پسند کی شادی کوئی اتنا بڑا ایشو تو نہیں۔'' حسان نے جھجکتے لہجے میں تائید کی۔

''نہیں سانی۔ یہی تو پرابلم ہے کہ ہمیں اصل پرابلم کا ہی نہیں پتا۔ پسند کی شادی کی وجہ سے نہیں ہوا یہ سب۔ چل چھوڑ۔ ہمیں اس سے کیا۔ تو بس مجھ سے وعدہ کر۔ اگر ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ میں اس کام کو نہیں کر پاتا تو تم کرو گے۔ وعدہ؟''

یسار نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔ حسان نے چند پل تذبذب کے عالم میں اسے دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کبھی کبھی کسی گھڑی کا کہا کس انداز میں پورا ہوتا ہے، انسان کی عقل سے ماورا ہے یہ بات۔

☆☆☆

کمرے میں گمبھیر خاموشی چھائی تھی۔ سب یوں خاموش بیٹھے تھے جیسے سحر پھونک دیا گیا ہو۔ کسی کسی پل زہرہ خاتون کی زخمی سی سسکی ابھرتی اور معدوم ہو جاتی۔ فاطمہ ممانی بھی بے آواز آنسو بہاتی بند کھڑکی سے باہر نظر آتے آسمان میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ ہر وقت چہکتی مینا جیسی ہنی کے ہاتھ میں تھما چپس کا پیکٹ بند تھا۔ رضا نے ایک بے بس نگاہ یسار عباد پر ڈالی اور جھکا لی۔ کچھ دیر پہلے اس نے مختصراً آرزو کی خراب طبیعت کے بارے میں بتایا تھا جسے سنتے ہی انیہ بی اور ممانی رونے لگی تھیں۔ اس سارے ماحول میں ایک واحد وہی تھا جو بظاہر سکون سے بیٹھا تھا کیونکہ وہ پاکستان آنے سے پہلے بہت سا رو کر آیا تھا۔ وہ وہاں کیسے حالات چھوڑ کر آیا تھا، یہ اس کا خدا جانتا تھا۔

''یسار۔ میرے بچے۔ یہ کیسا ظلم کیا تم نے میری جان پر۔ بے خبر تھی تو کم از کم یہ تو پتا تھا کہ میری بچی خوش ہے، آباد ہے۔ مگر تم نے بتا کر میرے دن رات کا چین ختم کر دیا۔''

زہرہ خاتون نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بے حد مدھم لہجے میں کہا۔ جس گھڑی سے انہیں آرزو کے بیمار ہونے کا پتا چلا تھا تب سے سارے گھر پر اداسی چھائی تھی۔ سبھی دل گیر تھے سوائے خان اللہ یار خان کے۔

''آپ ان کے لیے دعا کریں بس اور میرے لیے بھی کہ جس کام کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ تکمیل کو پہنچے۔ میں مایوس نہ لوٹوں۔''

''ان شاء اللہ۔ یسار بھائی۔ پھوپھو اپنے میکے ضرور آئیں گی۔ اس گھر کے دروازے ان پر ضرور کھلیں گے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔''

زہرہ خاتون کے بجائے رضا نے بے حد

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

مضبوط اور ٹھوس لہجے میں اسے یقین دہانی کروائی تھی۔ اس کے اس انداز پر فاطمہ ممانی اور زہرہ خاتون نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔ ہنی نے بھی جوش سے فوراً چپس کا پیکٹ کھولا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سب کو دیکھ کر رہ گیا۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ یہ تو ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جو سر ہو گیا ابھی آگے آزمائش کا پہاڑ اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا دھیان سلسبیل کی طرف بھی گیا۔ اسے رات کھانے کے بعد سے ابھی تک دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ عجیب لڑکی تھی۔ ٹھہرے پانی جیسی۔ جس کے چہرے کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو۔ نہ کوئی اتار چڑھاؤ نہ کسی احساس کی رمق۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہی وہ ماموں کی بیٹی ہے جو کیلیفورنیا میں ان دونوں کا موضوع گفتگو رہتی تھی۔ ساکن پانی میں کنکر مارنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ اور یہ مزہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایئرپورٹ پر کھڑے عباد لودھی اور آرزو عباد کا انتظار کر رہے تھے۔ آج ان کی پورے گیارہ دن بعد واپسی ہو رہی تھی۔ یسار حیران تھا کہ پندرہ سے بیس دن کا قیام یک دم مختصر کر کے ماما بابا واپس کیوں آ رہے ہیں مگر کال پر اس نے عباد سے تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ وہ بے چینی سے ان کے باہر آنے کے منتظر تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ اتنے دن وہ دونوں اکیلے رہے تھے۔ چار دن تو خوب عیش کیے تھے مگر پھر وہ انہیں یاد کرنے لگے۔ خاص طور پر یسار جو آرزو سے بے حد اٹیچ تھا۔

حسان کسی دوسرے کی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے بے نیازی سے آتی جاتی پبلک تک رہا تھا لیکن یسار بڑی فرصت سے محض چن چن کر لڑکیاں تاڑ رہا تھا۔

''سانی! یہ نیگرو دیکھ۔ اس کی آنکھیں بھینگی ہیں یا یہ دیکھ ہی تجھے رہی ہے؟''

''نہیں یہ تجھے دیکھ رہی ہے یار! کیونکہ تو نے شرٹ الٹی پہن رکھی ہے۔''

''نہیں اوئے۔'' یسار نے یک دم بوکھلا کر خود کا جائزہ لیا تو واقعی شرٹ کی سلائیاں دکھائی دیں۔ وہ ہمیشہ نک سک سے تیار ہونے کے بعد سب سے آخر میں شرٹ پہنتا تھا اور نکلتے وقت حسان نے ایسی ہڑبونگ مچائی تھی کہ اس نے بنا دیکھے ہی شرٹ چڑھا لی۔ بٹن بند کرتے ہوئے بھی اس کی عقل نے کام نہ کیا۔ اب وہ کھسیا کر پیشانی کھجاتے ہوئے دانت نکال رہا تھا۔

''تو بھی نا سانی۔ اتنا سا بھی فیشن سینس نہیں ہے تجھے۔ کٹی پھٹی پینٹس کے بعد اب یہ شرٹ الٹی پہننا بھی فیشن میں ہے۔ اسی لیے دیکھ لو لڑکیاں مجھے کیسے مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہیں۔''

''وہ جو مڑ کر دیکھ رہی ہیں وہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ کب تک خود کو بہلاؤ گے یار۔ مان جاؤ کہ میں تم سے زیادہ ہینڈسم ہوں۔'' حسان کی بے نیازی عروج پر تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مردانہ وجاہت میں حسان، یسار سے دو ہاتھ آگے ہی تھا۔

''ہٹو۔ یہ جو تمہارا چہرہ اتنا روشن لگتا ہے نا تو وہ میری روشنی کا عکس ہوتا ہے جو ساتھ چلتے تم پر پڑتا ہے۔'' یسار چڑ کے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بولا۔

''چپ کر جاؤ یار۔ ورنہ میں ہنستے ہنستے یہیں لیٹ جاؤں گا۔''

اس سے پہلے کہ یسار اسے اگلا جواب دیتا، سامنے سے عباد لودھی اور آرزو آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے مگر اگلے ہی پل وہ دونوں ٹھٹکے تھے۔ آرزو بے حد نڈھال اور پژمردہ سی عباد صاحب کے سہارے دھیمی چال چلتی آ رہی تھیں۔ عباد صاحب نے ان کے گرد اپنا بازو پھیلا رکھا تھا اور آرزو کا سر ان کے کندھے سے ٹکا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئیں اور لباس شکن آلود تھا۔

یہ ایسی سچویشن تھی جس نے دونوں کو ہی پریشان کر دیا تھا۔ چند پل تو وہ حیرت اور غائب

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

دماغی سے انہیں قریب آتا دیکھتے رہے مگر ادراک کے اگلے لمحے ہی وہ سرعت سے ان کی طرف بڑھے تھے۔

☆☆☆

علی الصبح اس کی آنکھ کھلی تھی۔ رات بہت دیر سے سونے کے باوجود وہ جلدی اٹھ گیا تھا۔ کچھ نئی جگہ، اوپر سے اندر پھیلی بے چینی۔

بستر چھوڑ کر اس نے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور باہر لان میں جھانکا تو دبیز دھند چاروں اور پھیلی نظر آئی۔ کسی کی یاد نے شدت سے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑا۔ وہ دونوں دھند میں باسکٹ بال پریکٹس کرنے کے شیدائی تھے۔ سرد موسم ان کے گرم اور جوشیلے جسموں کے آگے ٹھہر نہیں پاتا تھا۔ اس نے بھنویں سکوڑ کر آنکھوں کو مسلا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ارادہ لان میں جانے کا تھا۔ سیڑھیاں اترتا نیچے آیا تو کچن سے آتی برتنوں کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے یہ سوچ کر کہ اگر کوئی ملازمہ موجود ہے تو اس سے اپنے لیے کافی کا کہے، کچن کا رخ کیا۔

چولہے کے آگے سلسبیل کھڑی اپنے لیے شاید چائے بنا رہی تھی۔ اس کی پشت یسار کی طرف تھی پھر بھی وہ اسے پہچان گیا تھا۔ کمر سے نیچے آتی لمبے بالوں کی چوٹی کو یسار نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی چوٹی اس قدر موٹی تھی کہ نقلی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ حسن کے تمام لوازمات رکھتی تھی۔ کتنے ہی پل یسار اسے محویت سے دیکھتا رہا اور پھر بالآخر گلا کھنکھار کے سلسبیل کو متوجہ کیا۔

وہ اپنے دھیان میں مگن اس بری طرح ڈر کر اچھلی کہ ہاتھ میں تھاما مگ چھوٹ کر زمین بوس ہو گیا۔ صد شکر ابھی وہ خالی تھا۔ یسار خفت زدہ ٹوٹے مگ کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا تو کبھی اسے جو پلٹ کے اسے سرد نگاہوں سے دیکھتی بے حد اجنبی لگی۔

''کیا چاہیے آپ کو؟'' لہجہ بھی اسی قدر سرد تھا

''ایک کپ کافی۔ یا جو بھی مل سکے۔''

''جو بھی ہمارے چولہے پر نہیں بنتا۔۔ہاں آپ کے کیلیفورنیا میں ضرور بنتا ہوگا جبھی تو اسے پی کر آپ لوگ جو بھی، جس کے بھی ساتھ کر گزرتے ہیں۔''

اس کے اتنے کڑے طنز پر وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر یہ بات کس بنیاد پر اسے سنائی گئی ہے۔

''آپ جائیں۔ میں کافی بھجواتی ہوں۔''

اسے دو ٹوک وہاں سے جانے کا کہتی وہ پلٹ کر کیبنٹ سے کافی کا جار نکالنے لگی۔ یسار اس کے اندرونی خلفشار سے تمتماتے گلابی چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتا واپس مڑ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پلٹنے کے بعد سلسبیل کی نظریں مسلسل اس کی پشت پر گڑی ہیں اور وہ نم بھی ہیں۔

لان کی طرف جاتے اس کے قدم نہ جانے کیا سوچ کر خان اللہ یار خان کے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ایک لمحے کا توقف کیا، دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت سے ہلکا سا ناک کیا اور پھر ایک لمبی سانس کھینچتا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

ملگجے اندھیرے میں ایک طرف کونے میں زہرہ خاتون خوبصورت اونچی ٹیک والی آرام دہ کرسی پر بیٹھی کارنر لیمپ کی روشنی میں تلاوت کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک استقبالیہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا سیدھا خان اللہ یار خان کے بستر کی پائنتی تک آیا اور غیر محسوس انداز میں بیٹھ گیا۔ خان صاحب کو زہرہ خاتون نے کروٹ دلوا رکھی تھی اس لیے جب وہ بنا آواز وہاں بیٹھا تو وہ یہی سمجھے کہ زہرہ خاتون ہیں۔ انہوں نے نیم غنودہ آواز میں پکارا۔

''خانم۔ میری کمر کے پیچھے کوئی تکیہ لگا دو اور تھوڑا سا پانی بھی پلا دو۔''

یسار فوراً اٹھا اور تکیہ پکڑ کر ان کی کمر کے ساتھ لگایا پھر سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی گلاس

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

میں انڈیلا اور آگے بڑھ کر ان کی گردن کے گرد اپنا مضبوط بازو حمائل کیا، سہارے سے اتنا اٹھایا کہ آرام سے پانی پی سکیں۔ زہرہ خاتون کچھ سہمی اور کچھ کچھ خوشی کی کیفیت میں گھری یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ خان صاحب کی پشت یسار کی جانب تھی اس لیے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے اسے دیکھ تو نہ پائے تھے مگر ٹھٹکے ضرور تھے کیونکہ جس زور اور طاقت کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا تھا وہ زہرہ خاتون کا نہیں تھا۔ اس لیے جیسے ہی پانی پی کر گلاس ہٹایا، انہوں نے ذرا سا گردن موڑ کر دیکھا۔ وہاں یسار کے لیے چوڑے وجود کو خود پر تقریباً چھایا دیکھ کر ناگواری کی شکنیں ان کی پیشانی پر ابھر آئیں۔ انہوں نے خود کو ایک جھٹکے سے یسار کے بازو کے حصار سے آزاد کرانا چاہا مگر یسار نے اس سے پہلے ہی بہت احتیاط سے انہیں واپس لٹا دیا۔

''میرے قریب آنے کی جرأت بھی کیسے کی تم نے لڑکے؟''

ان کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یسار کو کمرے سے دھکے مار کر خود نکالتے۔

''مجھے یہ جرأت آپ سے تعلق نے دی ہے۔ اس رشتے نے دی ہے جو آپ کے اور میرے بیچ ازل سے ہے مگر جس سے آپ انکاری ہیں۔'' وہ سائیڈ ٹیبل پر گلاس رکھتا واپس سکون سے ان کے قدموں کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ خان صاحب جواب میں بالکل خاموش رہے۔

یسار نے زہرہ خاتون سے ان کی فزیوتھراپی اور دیگر ٹریٹمنٹ کے متعلق پوچھا۔ ساتھ ہی سائیڈ ٹیبل سے ادویات اٹھا اٹھا کر بغور دیکھتا جا رہا تھا۔ زہرہ خاتون، خان صاحب کی ناگواری کو نظر انداز کیے اسے یوں ساری تفصیل دے رہی تھیں جیسے وہی ان کا ڈاکٹر ہو۔

''ہم..... آج سے میں خود ان کو دوا بھی دوں گا اور کھانا بھی میں ہی کھلاؤں گا۔ ان کی وہیل چیئر نہیں ہے؟''

''خبردار! جو میرے کسی معاملے میں پڑنے کی کوشش کی تو۔ اس سے اچھا میں زہر پھانک لوں۔'' خان صاحب کی طیش میں ڈوبی آواز آئی جسے یسار نے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''انیہ بی۔ ان کی وہیل چیئر ہے کیا؟''

''ہاں۔ ہاں میرے بچے بالکل ہے مگر بے کار پڑی ہے کیونکہ انہوں نے خود کو اس کمرے تک محدود کر لیا ہے۔ ڈاکٹر کے بارہا کہنے اور ہم سب کے اصرار کے باوجود بھی یہ باہر نہیں جاتے۔ جب سے اسفند گیا ہے۔ انہیں تو جیسے۔''

''خاموش ہو جاؤ زہرہ! پرائے لوگوں کے سامنے پیٹھ نہیں ننگی کی جاتی۔'' وہ بیوی کی بات کاٹتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولے تو یسار کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آزردہ خاطر ہوتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کی پیٹھ ہی تو ڈھکنے آیا ہوں داجی۔ اپنوں سے ناراضی ایسا چابک ہے جو مسلسل پڑتا رہے تو لباس کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں اور انسان یہ ادراک بھی نہیں کر پاتا کہ اس کا برہنہ جسم ساری دنیا کے سامنے ہے۔''

زہرہ خاتون کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ جوان بیٹے کی موت اور آرزو کی یاد دل کو کاٹنے لگی۔

یسار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ایک بار پھر یاد دہانی کرائی۔

''میں ابھی کچھ دیر میں جاگنگ کر کے آجاؤں گا، تب تک آپ داجی کا بریک فاسٹ ریڈی کروائیں، میں خود انہیں کھلاؤں گا۔ اس کے بعد میں انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لے جاؤں گا۔''

وہ خان صاحب کے ردعمل کا انتظار کیے بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔ زہرہ خاتون دوبارہ سے تلاوت میں مشغول ہو چکی تھیں۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ کروٹ کے بل لیٹے پتھریلے چہرے والے خان اللہ یار خان کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر تکیے میں جا چھپا۔

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

یادوں کا کانچ چٹختا تو وہ جانتے تھے کہ ان کا پور پور فگار ہوگا۔

☆☆☆

عباد لودھی اور آرزو کے لوٹ آنے کے باوجود سارے گھر پر افسردگی چھائی تھی۔ آرزو کے اکلوتے بھائی اسفندیار خان کا انتقال ہو گیا تھا اور انہیں یہ خبر ان کی موت کے ایک ہفتے بعد مل رہی تھی۔ اسی بات کے قلق نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ اکلوتے چھوٹے بھائی کو دائمی سفر پر جانے سے پہلے دیکھ نہ پانا ان کے دل کا روگ بن گیا تھا۔ یہ اطلاع انہیں زینیا کے گھر ہی کسی کے توسط سے ملی تھی اور تب سے لے کر اب تک وہ اس قدر رو چکی تھیں کہ مجبوراً عباد صاحب کو ان کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر سکون آور دوا دے کر سلانا پڑا تھا۔

حسان کو عباد صاحب نے بہت ضروری کام کی وجہ سے زبردستی اسٹور بھیجا تھا ورنہ اس نے اور یسار نے آرزو کی خاطر آفس سے بھی چھٹی کر لی تھی۔ عباد صاحب، یسار سے زیادہ حسان کی قابلیت پر بھروسہ کرتے تھے۔ یسار کی لاابالی نیچر کی وجہ سے وہ اسے بھاری ذمہ داری دینے سے کتراتے تھے۔

یسار سٹنگ روم میں صوفے پر نیم دراز، دھیان ٹی وی پر جمائے مسلسل ماما کے گھر والوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ان کی اس خود غرضی پر اس کا دل بہت دکھا تھا۔

اسے سلسبیل سے بھی شکوہ تھا۔ وہ بھی پورے نو دس دن سے غائب تھی۔ یقیناً اپنے والد کی وفات کے صدمے میں گھری تھی تب ہی آن لائن نہیں آ پا رہی تھی مگر کیا وہ اتنا بھی اہم نہیں تھا کہ اسے ایک چھوٹی سی اطلاع اس سانحے کی دے دیتی تو شائد ماما کو وہ بروقت آگاہ کر پاتا۔ شاید وہ پاکستان جانے کی ہمت کر پاتیں اور شاید بیٹے کے غم میں ڈوبے اس کے نانا نانی، بیٹی کو سینے سے لگا لیتے۔

وہ اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے اندازہ بھی نہیں ہو پایا کہ عباد صاحب کب سے اس کے دائیں طرف والے صوفے پر براجمان بغور اس کے چہرے کے تاثرات ملاحظہ کر رہے تھے۔

''جوانی میں مجھے بھی تمہاری طرح خود سے لڑنے کی عادت تھی۔'' انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

یسار ان کی آواز سنتے ہی فوراً لیٹے سے اٹھ بیٹھا اور پھر اعصاب ڈھیلے چھوڑتا ہوا ان کے قدموں میں کارپٹ پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

''اوہ رئیلی۔ پھر کون جیتا کرتا تھا؟''

''پتا نہیں۔ مگر اس کے بعد میں ہمیشہ وہی کیا کرتا تھا جو میرا اندر مجھ سے کروانے کی چاہ رکھتا تھا۔''

''بات تو ایک ہی ہوئی نا بابا۔''

''سوچ کی بات ہے۔ !۔ ویسے تم کیوں لڑ رہے ہو۔ کیا منوانا ہے؟'' وہ مختصراً کہہ کر اصل بات پر آئے۔

''بابا۔ جسے ہم اپنی زندگی میں حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اس کی نظر میں ہماری ویسی وقعت نہیں ہوتی تو کیا کرنا چاہیے۔''

''پہلے تو یہ فیصلہ کرو کہ یہ اہمیت، گو اینڈ ٹیک سے مشروط ہے؟ اگر ہے تو پھر اہمیت نہیں ہے بلکہ وقتی ابال ہے، غرض ہے اور اگر غیر مشروط ہے تو شکوہ کرنا بنتا ہی نہیں مائی سن۔'' انہوں نے ابرو اچکا کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

''گھیر لیا مجھے۔ یہ فاؤل ہے۔ چلیں چھوڑیں۔ آج پلیز بابا۔ پلیز۔ مجھے بتائیں کہ آخر نانا کو کیا ایشو تھا آپ دونوں کی پسند کی شادی پر۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ ساری عمر کے لیے بیٹی سے رشتہ ختم کر دیا۔ مجھ سے ماما کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ ایسا بھی کیا قصور کر دیا بابا؟''

''کیونکہ یہ پسند کی نہیں۔ یہ ''چھل'' کی شادی تھی..... چھل یعنی دھوکا۔ وہ دھوکا جو تمہارے نانا نے ہم دونوں کے تعلق کو لے کر کھایا۔ بڑی عجیب کہانی ہے۔ سنو گے تو حیرت ہوگی۔ لو پھر آج سناتا ہوں۔

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

☆☆☆

نقشین جھروکوں اور اونچے محرابوں والی حویلی کی طرز پر بنی دو کنال پر پھیلی یہ وسیع و عریض کوٹھی خان اللہ یار خان کی تھی۔ سرخ پتھروں سے بنی ہوئی تھی اس لیے لال کوٹھی کے نام سے مشہور تھی۔ دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ آرزو ان کی بے حد لاڈلی تھی کیونکہ اس سے پہلے خان صاحب کے ہاں تین اولادیں ہوئی تھیں مگر بچی نہیں تھیں۔ اس لیے جب آرزو کی ولادت ہوئی تو خان اللہ یار خان نے خزانے کے منہ کھول دیے تھے۔ صدقہ خیرات اس قدر کیا کہ مانگنے والے دنگ رہ گئے۔ ہر گھڑی دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ زہرہ خاتون ان کی دیوانگی پر ہنس دیتی تھیں تو کبھی جھنجھلا جاتیں۔ کیونکہ جیسے ہی آرزو کے رونے کی آواز خان صاحب کے کان میں پڑتی، وہ گھر کے جس کونے میں بھی ہوتے، دوڑے چلے آتے۔ ملازمائیں پردوں کی آڑ میں ہنستیں مگر انہیں چنداں فرق نہیں پڑتا تھا۔

تین سال تک قندھاری انار جیسے گالوں والی آرزو ان کی محبت کی شدتوں کا مرکز رہی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی غیر بھی اسے دیکھ کر پیار کیے بنا نہیں رہ پاتا تھا تو باپ کے وہ تو جگر کا ٹکڑا تھی۔ زہرہ خاتون کو تو کبھی ڈھنگ سے موقع ہی نہ مل سکا تھا اس کے لاڈ اٹھانے کا۔ دن میں اتنے بڑے گھر کے سو جھمیلے اور جب خان صاحب آ جاتے تو بس پھر آرزو ان ہی کے پاس رہتی۔ آرزو کے بعد اسفند یار آیا اور زہرہ خاتون کی ممتا کی تمام تشنگیاں دور کر گیا۔ انہیں بھی کھیلنے کے لیے ایک کھلونا مل گیا۔

خان اللہ یار خان کی چھاتی بیٹے کو پا کر چوڑی ضرور ہوئی مگر آرزو کی جگہ اسفند یار بھی نہ لے سکا۔ وہ ایسا سیپ تھی جس میں کسی موتی کی طرح خان اللہ یار خان کی جان بند تھی۔ ہمیں اکثر تکلیف ایسے رشتوں سے ہی پہنچتی ہے جن پر ہم اپنی تمام محبتیں نچھاور کرتے ہیں۔ ہم اپنی امیدوں کا گھڑ اسی کے کندھوں پر ہی کیوں رکھتے ہیں جسے ہم سب سے زیادہ چاہتے ہیں اور جب وہ اس کا بوجھ سہار نہیں پاتا تو یک دم اپنی محبت کی گھنی چھاؤں اس کے سر سے سرکا دیتے ہیں۔ اس کے بعد دل ایسا پتھر ہوتا ہے کہ بھلے وہ تپتی دھوپ میں جلے یا طوفان اس کے قدم اکھاڑ پھینکے۔ ہمارے دل پر دھرا پتھر کبھی موم نہیں ہوتا۔

خان اللہ یار خان کے گھر کا ماحول روایتی تھا۔ زہرہ خاتون خود بھی پردے کی سخت پابند تھیں اور آرزو کو بھی گیارہ سال کی عمر سے مکمل پردہ کروا کر اسکول بھیجا جانے لگا۔ اتنے لاڈ پیار کے باوجود آرزو بے حد سلجھی ہوئی بچی تھی۔ نہ بے جا ضد کرتی تھی نہ ہی طبیعت میں نخرہ تھا۔ کتابی کیڑا تھی۔ ہر وقت سر کتابوں میں گھسائے رکھتی تھی۔ خان صاحب کو اخبار پڑھ کر سنانا بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ انہیں بہت لطف آتا تھا آرزو کے بھولے بھالے لب و لہجے کو سننے میں۔ نسلاً پٹھان تھے۔ گھر کے ماحول میں علاقے کی روایات اور اطوار کا اثر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے بیٹی کو محض میٹرک کروانے کا ارادہ تھا۔ لیکن جب آرزو نے میٹرک کے امتحانات میں پورے صوبے میں دوسری پوزیشن لی تو خان اللہ یار خان کا سینہ بھی فخر سے چوڑا ہو گیا تھا۔

وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی اور یہیں انہوں نے اپنی روایات سے پہلی بغاوت محض آرزو کی خوشی کے لیے کی۔ اسے کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ آرزو نے بھی انہیں کسی طور مایوس نہیں کیا۔ وہ پردے کا مکمل اہتمام کر کے کالج جاتی تھی۔ پڑھائی سے لگن اس کے امتحانات کے نتیجوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ یوں آرزو اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے گریجویشن کیا تھا۔

خان اللہ یار خان کو خاندانی مخالفت کا سامنا رہا تھا لیکن آرزو کے بہترین طرز عمل کی وجہ سے چند دیگر رشتے داروں نے بھی اپنی بچیوں کو کالجوں میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ خان صاحب کو لگا، اب آرزو کا بیاہ ہو جانا

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

چاہیے۔ آرزو کی بات اپنے تایازاد ولی محمد کے ساتھ طے تھی۔ اس لیے خان صاحب نے زہرہ خاتون کو شادی کی تیاریاں کرنے کا عندیہ دے دیا مگر زہرہ خاتون شش و پنج میں مبتلا تھیں۔

آرزو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس معاملے میں اسفند یار بھی اس کا حامی تھا۔ اس کی اور آرزو کی بہت دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے تمام مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ آرزو نے سب سے پہلے اس سے ہی کہا تھا کہ وہ بابا کو اس کی مزید تعلیم کے لیے راضی کرے مگر اسفند یار کو شروع سے خان صاحب نے شیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا اور اس کے بگڑنے کے خیال سے اسے کبھی فری ہینڈ نہیں دیا تھا۔ وہ تو خود اپنی بات منوانے کے لیے آرزو کا سہارا لیتا تھا جس کی ہر بات وہ مان لیتے تھے۔ ایسے میں بھلا وہ کیسے آرزو کے یونیورسٹی پڑھنے کے لیے بابا کو راضی کرتا جبکہ شہر میں ایک ہی یونیورسٹی تھی اور وہ بھی کو ایجوکیشن۔ سو یہ مرحلہ زہرہ خاتون نے سر کرنے کی ٹھانی۔

اس رات کھانے کے بعد خان صاحب کا قہوہ تیار کر کے لے جاتے ہوئے وہ مسلسل ورد کیے جا رہی تھیں۔ آرزو اور اسفند الگ ان کے ہاتھ پیر پھلائے ہوئے تھے۔ آج انہیں ہر حال میں خان صاحب سے بات کرنی تھی کیونکہ دو دن بعد فارمز جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی اور آرزو فکر سے بے حال پورے گھر میں چکرائی پھر رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو اسفند نے فوراً اپنی جیب سے پین نکال کر دروازے کے بیچ پھنسا کر اسے مکمل بند ہونے سے روکا تاکہ اندر کی آواز باہر آ سکے۔

وہ دونوں بہن بھائی دروازے سے کان لگائے، دم سادھے باہر ہی کھڑے تھے۔

''وہ خان۔ آپ سے ایک بات کہنی تھی۔''

زہرہ خاتون نے تمہید باندھی۔

''کہو خانم۔ تمہیں اجازت لینے کی ضرورت کب سے پڑ گئی۔'' وہ محبت سے زہرہ خاتون کو خانم بلاتے تھے۔

''خان۔ آپ آرزو سے کتنی محبت کرتے ہیں؟

''یہ کیا بے تکا سوال ہے خانم۔ بھلا تمہیں اندازہ نہیں۔ مجھے اسفند یار سے زیادہ آرزو پیاری ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات ہے؟''

باہر کھڑی آرزو نے اسفند کو فخریہ پسلیوں میں ٹہوکا دیا تو وہ اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ دونوں نے کان دوبارہ اندر سے آتی آوازوں کی طرف لگائے۔

''اگر آپ کو آرزو اتنی پیاری ہے خان۔ تو اس کی شادی سے پہلے اس کی ایک اور خواہش پوری کر دیں۔''

خان اللہ یار خان چونک کر سیدھے ہوئے۔ آنکھوں پر لگی عینک اور ہاتھ میں تھاما صبح کا اخبار دونوں سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور استفہامیہ نظروں سے زہرہ خاتون کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''ایسی کون سی خواہش ہے خانم! جو آرزو خود مجھ سے نہیں کہہ سکی۔ بھلا میں نے آج تک اس کا کہا ٹالا ہے۔''

''خان۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ ایم اے کرنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی سے۔''

زہرہ خاتون نے جھجکتے ہوئے آرزو کی خواہش بیان کی۔ ساتھ ہی کن اکھیوں سے میاں کے چہرے کا جائزہ لیا۔ خان صاحب یک دم خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ زہرہ خاتون کو یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آیا ان کے چہرے پر ناراضی کے تاثرات ہیں یا تفکر کے۔ کچھ دیر وہ یونہی بیٹھے رہے۔ باہر کھڑے اسفند اور آرزو کی حالت سسپنس کے مارے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ تب ہی انہوں نے ہنکارا بھرا اور بولے۔

''خانم۔ تم جانتی ہو کہ پہلے ہی ہم نے خاندان بھر سے بغاوت کر کے اپنی بیٹی کو پڑھایا ہے۔ ابھی تک بڑے بھائی صاحب ہمیں اس بات کے طعنے دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کو انہیں آرزو کو اس

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

حوالے سے کچھ کہنے کا موقع ملے۔"

"نہیں۔ مجھے نہیں لگتا خان کہ ولی محمد اس بات کی وجہ سے کبھی بھی آرزو کو طعنے دے گا۔ آخر آرزو کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اپنی بہنوں کو کالج میں داخلہ دلوایا ہے خان۔"

انہوں نے آرزو کے منگیتر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن خانم۔ وہاں لڑکے بھی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو۔" خان اللہ یار خان کی آواز میں خدشات بول رہے تھے۔

"ان شاء اللہ خان۔ کبھی نہیں ہوگا ایسا۔ کیا آپ کو آرزو پر بھروسا نہیں؟"

"اپنی بیٹی پر تو ہے لیکن زمانے کا کیا اعتبار۔"

"آپ اپنی بیٹی کا مان رکھیں خان۔ وہ آپ کا مان کبھی نہیں توڑے گی۔"

خان اللہ یار خان کچھ کچھ قائل ہوتے خاموش ہوگئے۔ اگلے ایک دو دن میں زہرہ خاتون نے بھی انہیں مکمل منا کر ہی دم لیا۔ یوں آرزو خان اپنے خاندان کی یونیورسٹی جانے والی بھی پہلی لڑکی ثابت ہوئی۔

☆☆☆

سر سے لے کر پیر تک بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی آرزو خان جس وقت اپنی اکلوتی دوست زرمین کے ساتھ یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو اس کے حلیے نے بہت سے اسٹوڈنٹس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بااعتماد تھی اس لیے اسے ہرگز بھی گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ وہ بے حد نارمل انداز میں خود ہی سارے ڈیپارٹمنٹس چھانتی رہی تھی۔ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ تک پہنچتے پہنچتے تقریباً ہر دوسرے اسٹوڈنٹ کی زبان پر اس کی آنکھوں کا چرچا تھا۔ نیلے کانچ سی اس کی غلافی آنکھوں میں سحر تھا۔

سیاہ نقاب میں جگر جگر کرتی اس کی آنکھوں نے کئی لڑکیوں کو پہلے دن ہی اس کے آگے دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کردیا۔ ان میں سے زیادہ تر اس کے چہرے کو دیکھنے کے تجسس میں اس کی جانب بڑھی تھیں کہ جس کی آنکھوں کا یہ عالم تھا تو چہرہ کیا غضب ڈھاتا ہوگا۔ لیکن آرزو محض بہت بے تکلف سہیلیوں کے سامنے ہی چہرے سے نقاب ہٹایا کرتی تھی۔ ذہین تو وہ شروع سے تھی اور اس کا اندازہ آنے والے دنوں میں اس کے کلاس فیلوز کے علاوہ اساتذہ کو بھی ہوگیا۔ بہت کم وقت لگا تھا آرزو خان کو یونیورسٹی میں مشہور ہونے میں۔

زرلالہ ان چند لڑکیوں میں سے تھی جنہوں نے ابتدا میں آرزو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس نے زرلالہ کو نظر انداز کردیا تھا۔ اسے برا ضرور لگا مگر برداشت کرگئی۔ درحقیقت وہ اسے دیکھنے کی مشتاق تھی۔ زرلالہ فزکس ڈیپارٹمنٹ کے فائنل ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ خاصی طرح دار اور شوآف تھی لیکن پڑھائی میں اچھی تھی بلکہ اس کے گروپ کے پانچوں افراد لائق اسٹوڈنٹس تھے اور سب ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

فاکہہ، زرلالہ کی اسکول کے زمانے سے دوست چلی آرہی تھی اور اب تک تھی۔ وہ زرلالہ سے بری طرح متاثر تھی اور اسی لیے اس کے پیچھے پلو تھامے چلتی تھی۔ زرلالہ کے اسائنمنٹس کا زیادہ بوجھ اسی کے کندھوں پر تھا جسے وہ بڑے شوق سے ڈھوتی آرہی تھی۔

باقی تینوں لڑکے ذورین درانی، قاسم نواز اور عماد لودھی کی ان دونوں سے زیادہ آپس میں بنتی تھی۔ عماد اور قاسم نے پچھلے سال ہی بڑی کوشش کی تھی زرلالہ اور فاکہہ سے جان چھڑانے کی مگر ایک تو وہ دونوں خود ہی زبردستی گروپ بنا کے بیٹھ گئی تھیں اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ذورین کا زرلالہ پر کرش تھا۔ وہ دونوں لاکھ ناک منہ چڑھاتے مگر ذورین اس کے قدموں میں نچھاور ہونے کو تیار رہتا تھا اور فاکہہ تو اس کے صدقے اپنی جگہ بنا ہی لیتی تھی۔

زرلالہ کو آرزو سے سب سے پہلی پرخاش اسی وقت ہوئی تھی جب ایک دن وہ فاکہہ کے ساتھ

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

کینٹین سے برگرز اور کوک ٹرے میں اٹھائے بطور خاص اکنامکس ڈیپارٹمنٹ لے گئی تھی۔ وہاں بالکل الگ تھلگ گھاس کے ایک چھوٹے سے قطعے پر آرزو اور زرمین اپنے گروپ کی باقی چار لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے درمیان میں چھوٹا سا کیک رکھا تھا جس پر ایک ہی موم بتی جل رہی تھی۔

شیما کی سالگرہ تھی اور وہ گھر سے خود یہ کیک بیک کر کے لائی تھی۔ وہ سب کسی بات پر دھیما دھیما ہنس رہی تھیں۔ جیسے ہی شیما نے چھری کیک کی طرف بڑھائی، اس کے پہلو سے لگی ربیعہ فوراً پھونک مار کے کینڈل بجھا دیتی۔ شیما شور مچا دیتی اور دوبارہ سے جلاتی۔ یہ شغل پچھلے دو منٹ سے جاری تھا۔ بالکل سیدھ میں نقاب کیے بیٹھی آرزو کی آنکھیں ہنس ہنس کر نم ہوئی جاتی تھیں۔ زرلالہ کو یہ منظر آگ لگا گیا۔

وہ تیزی سے ٹرے لیے آگے بڑھی اور اچانک اس نے دھپ سے بیٹھتے ہوئے ٹرے کیک کے اوپر رکھ دی۔ چھوٹا سا کیک اتنی وزنی ٹرے کا بوجھ سہار نہیں پایا اور اس کا بیڑا غرق ہو گیا۔ وہ ساری ہکا بکا دیکھتی رہ گئیں۔ زرلالہ، شیما اور ربیعہ کے درمیان بیٹھ چکی تھی۔ سینئر ہونے کے زعم میں مسلسل چٹکی بجاتے ہوئے بے تکلفی سے یوں بولی جیسے پرانی دوستی چلی آ رہی ہو۔

''ہیلو۔ آج کا لنچ میری طرف سے۔ مجھے تعارف کروانے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ اور تم سب کو میں جانتی ہی ہوں لیکن تم۔'' اس نے آرزو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔'' چلو بھئی چلو مس بیوٹی کوئین۔ اب تم اپنا سینما دکھا ہی دو مجھے۔''

''سینما۔'' اس نے آرزو کے چہرے کو کہا تھا۔ آرزو کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔ لیکن تحمل سے بولی۔

''ساری یونیورسٹی کے پاس دیکھنے کے لیے تمہارا سینما ہے نا۔ یہی کافی ہے اور اس بدتمیزی کے لیے ہم سب نے تمہیں معاف کیا۔'' وہ اپنا بیگ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایکسکیوزمی۔ مجھے لائبریری جانا ہے۔'' وہ باوقار انداز میں چلتی وہاں سے جا چکی تھی۔ باقی سب نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اپنے بیگز اٹھائے اور اسی کے پیچھے چل دیں۔ پیچھے زرلالہ، فاکہہ کے ساتھ غصے سے سرخ چہرہ لیے بیٹھی رہ گئی۔

''زری۔ دفع کرو۔ آؤ یہ ٹرے لے کر ہم اپنے گروپ میں چلتے ہیں۔ ساتھ میں یہ کیک بھی لے چلتے ہیں۔ ان کا کیک اب ہم کھا کر بدلہ پورا کریں گے۔'' فاکہہ نے للچائی نظروں سے ٹرے کے نیچے دبے پڑے بدحال کیک کو دیکھتے ہوئے کہا تو زرلالہ یک دم پھٹ ہی پڑی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم بھی اور کیک بھی۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اور خبردار جو میرے پیچھے آئیں۔ اکیلا چھوڑ دو کچھ دیر کے لیے مجھے۔'' شہادت کی انگلی سے اسے وارن کرتی وہ تنتناتی ہوئی ایک جانب نکل گئی۔ پیچھے فاکہہ نے چور نظروں سے اردگرد دیکھا اور جلدی سے کیک کے بچے ہوئے سالم ٹکڑے اٹھائے اور ٹرے میں رکھ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

☆☆☆

''آرزو خان نے سیکنڈ سمسٹر میں اس بار مغیث احمد کو بھی چت کر دیا یار۔ ماننا پڑے گا کہ یہ لڑکی بہت ذہین ہے بلکہ خوب صورتی اور ذہانت کا امتزاج۔''

وہ چاروں کینٹین میں بیٹھے تھے جب قاسم نواز نے ٹیبل پر فولڈر رکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی چیئر گھسیٹ کر بیٹھ بھی گیا اور درمیان میں پڑے سموسوں کو دیکھ کر چٹخارہ بھرا۔ زرلالہ نے اسے ترچھی نگاہ سے دیکھا اور بے نیازی سے ذورین کے اسائنمنٹس چیک کرنے لگی۔ عماد لودھی نے مسکرا کر سر اٹھایا اور بولا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی بہت ذہین ہے۔ ہاں لیکن تمہیں اس کی خوب صورتی کو ڈسکس

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم میں سے کسی نے بھی آج تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔"

"آبزرویشن بھی کوئی چیز ہوتی ہے یار۔" قاسم نے آنکھیں پھیلائیں۔"اس کی آنکھیں پوری یونیورسٹی میں مشہور ہیں۔ اور پردے سے باہر اس کے ہاتھ، پاؤں کی بے پناہ سفیدی اور بناوٹ ان کی خوب صورتی کا پتا دیتی ہے۔ اب کوئی اندھا بھی گیس کرسکتا ہے کہ وہ پری چہرہ ہے۔"

عماد کو اس کا تبصرہ ناگوار گزرا تھا۔ وہ آرزو کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اس کے دل میں آج تک ایک پل کے لیے بھی یہ چاہ پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کا چہرہ دیکھے بلکہ جب بھی ایسا کوئی ذکر ہوتا تو وہ بہانے سے موضوع بدل دیتا تھا۔ باقی رہ گیا ذورین تو زرلالہ کی موجودگی میں وہ آرزو کے بارے میں کوئی رائے دے کر ذلیل نہیں ہوسکتا تھا۔

"پلیز قاسم۔ یار! وہ بہت اچھی اور نیک سیرت لڑکی ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے اس طرح ڈسکس کریں۔" عماد کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ قاسم بھی تائید میں دونوں ہاتھ کھڑے کرکے سر ہلاتا دوبارہ سموسوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تمہیں اس کی نیک سیرتی کا الہام ہوا ہے کیا عماد لودھی؟ اور تم۔" اس نے قاسم نواز کی طرف انگلی اٹھا کر مخاطب کیا۔" تمہاری آبزرویشن کے کیا کہنے۔ ٹنڈے کو شلجم اور شلجم کو اروی کہنے والا قاسم نواز اتنا زیرک کب سے ہوگیا کہ پردے کے پیچھے سے ہی اسے آرزو خان کے جلوے دکھ گئے۔ کیا پتا کہ اس کا چہرہ اس قابل ہی نہ ہو کہ اسے دیکھا جاسکے؟"

اس کی بات پر ایک پل کو سب ہی کو سانپ سونگھ گیا سوائے فاکہہ کے جو مسلسل ہونقوں کی طرح منہ کھولے اثبات میں سر ہلائے جارہی تھی۔

"واٹ ربش۔" بالآخر عماد بول اٹھا۔" اپنی جلن میں اتنا آگے مت بڑھو زرلالہ کہ دوسروں کو تمہاری باتوں سے کوفت ہونے لگے۔ صاف محسوس ہورہا ہے کہ تمہیں آرزو سے حسد ہے۔ لیکن میں اس کی بے حد رسپیکٹ کرتا ہوں، اتنی کہ میرا بس چلے تو اسے اپنی بھابھی بنالوں۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ انگیج ہے تو میں یقیناً ایسا کرگزرتا۔"

عماد نے زرلالہ کو محض چڑانے کی خاطر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ سب جانتے تھے کہ زرلالہ اس کے بڑے بھائی پر دل و جان سے فدا تھی اور اسی سے قریب ہونے کی خاطر اس نے عماد سے دوستی کر رکھی تھی۔ ایک آدھ بار وہ نوٹس کے بہانے تو کبھی عماد کی سالگرہ پر سب فرینڈز کو ساتھ لے کر وش کرنے کے بہانے اس کے گھر تک بھی ہوآئی تھی۔ مگر اس کی دال گلی نہیں تھی۔

عماد بہت لیے دیے رہتے تھے، درحقیقت وہ زرلالہ کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے ان کے درمیان بیٹھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ زرلالہ ان کا گریز جان کر بھی انجان تھی۔ عماد کا آرزو کی ہر بات کو سراہنا ہی زرلالہ کے دل میں اس کی نفرت کا بیج بوگیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس کا موازنہ خود سے کرنے لگی تھی۔ اسے دیکھنے کی خواہش محض اس لیے تھی کہ وہ آرزو کا حسن جانچنا چاہتی تھی، آیا اس کی ٹکر کا ہے یا نہیں۔ مگر بات اب یہاں تک نہیں رہی تھی، یہ پرخاش بڑھتے بڑھتے ذاتیات کا رخ اختیار کرچکی تھی۔ اور عماد کی باتوں نے زرلالہ کو جلتے توے پر لا بٹھایا تھا۔ وہ بھنائی ہوئی دونوں ہتھیلیاں میز پر مارتے ہوئے بولی۔

"مائی فٹ۔ اوقات کیا ہے اس کی۔ تمبو پہن کر وہ معتبر نہیں ہوگئی۔ آدھی یونیورسٹی اس کے حلیے سے بے زار ہے۔ سمجھے تم۔" اس کے سر سے لگی بجھنے میں نہیں آرہی تھی۔

"اس آدھی یونیورسٹی نے جب انگور کھٹے دیکھے تب ہی بے زار ہوکر چلتے بنے۔ اور تمہیں یاد ہو کہ نا یاد ہو، تم پر بھی یہ مقولہ فٹ بیٹھتا ہے۔"

"یار پلیز۔ چینج دا ٹاپک۔"

ذورین، زرلالہ کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات سے خائف ہوکر بولا۔ مگر کوئی فائدہ نہیں

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

ہوا۔ وہ بے حد خراب موڈ کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور عماد کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔

''تم نے اس کی جتنی وکالت کرنی تھی کرلی عماد لودھی۔ اب میں۔'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ''زرلالہ ساری یونیورسٹی کو آرزو خان کا چہرہ دکھا کے رہوں گی۔ کیسے؟ جسٹ ویٹ اینڈ واچ۔''

وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی چچی بھی پیچھے پیچھے تھی۔ ذورین خفا خفا سا عماد اور قاسم کو دیکھ رہا تھا۔ قاسم نے ''سوواٹ'' کے انداز میں کندھے اچکا دیے تھے مگر بظاہر نارمل نظر آتے عماد لودھی کو اندر ہی اندر فکر لاحق ہوگئی تھی۔ زرلالہ ختم مزاج لڑکی تھی۔ اور آرزو کی وہ عقیدت کی حد تک عزت کرتا تھا۔ اسے کبھی بھی گوارا نہ تھا کہ اس فضول سی تکرار کے پیچھے اس کا کوئی نقصان ہوتا۔ اس نے دل میں اپنے بڑے بھائی سے اس بارے میں بات کرنے کی ٹھانی۔ وہ اس یونیورسٹی کا پوزیشن ہولڈر ایکس اسٹوڈنٹ رہ چکا تھا۔

جیم اسٹون۔ عباد لودھی۔

☆☆☆

مراد یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ یونین کا وائس پریزیڈنٹ تھا۔ انتہائی شاطر اور عیار شخص تھا۔ آئے روز یونیورسٹی میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ مچائے رکھنا اس کا شوق تھا۔ پڑھائی میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی مگر امتحانات میں نمبرز حاصل کرنا اس کے لیے کبھی بھی بڑا ایشو نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کئی سال اس کا بڑا بھائی سرمد یونیورسٹی کو جونک کی طرح چمٹا رہا تھا۔ وہ عماد لودھی کے بڑے بھائی عباد لودھی کا بیچ میٹ تھا مگر دونوں کا آپس میں زبردست ٹکراؤ رہتا تھا۔

سرمد، عباد لودھی کی ہر مقبولیت سے بری طرح خائف رہا کرتا تھا۔ عباد اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول تھا۔ وہ بہترین ڈیبیٹر اور باسکٹ بال پلیئر رہ چکا تھا۔

زرلالہ تب یونیورسٹی میں نئی تھی مگر عباد لودھی پر بری طرح فریفتہ تھی۔ عباد لودھی کی تربیت ان خطوط پر نہیں ہوئی تھی کہ وہ یونیورسٹی کی راہداریوں میں لڑکی کے ساتھ ٹہلتا پھرے لہٰذا زرلالہ کو کوئی رسپانس نہ مل سکا۔

عباد لودھی بہترین تعلیمی ریکارڈ بنانے کے بعد یہاں سے رخصت ہوا مگر اساتذہ اور اسٹوڈنٹس کے دلوں میں انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ سرمد اس کی ان ہی صلاحیتوں کی وجہ سے دوران تعلیم بارہا اسے چھوٹے موٹے نقصان پہنچانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اب وہ خود تو جا چکا تھا مگر اپنا بھائی ''پلانٹ'' کر کے گیا تھا۔ مراد اس سے چار ہاتھ آگے تھا۔ سرمد محض فتنہ پرور تھا اور لڑکیوں سے ذرا فاصلے پر ہی رہتا تھا جبکہ مراد میں لڑکیاں گھیرنے کی صفت بھی پائی جاتی تھی اور چند دن جاتے تھے جب پوری یونیورسٹی نے زرلالہ اور مراد کو پہلو بہ پہلو دیکھا۔ وہ دونوں مستقل ساتھ دیکھے جانے لگے تھے۔

ذورین درانی اس صورت حال سے خاصا رنجیدہ تھا، عماد اور قاسم اسے اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے مگر اس کے دل سے زرلالہ کے منہ پھیرنے کا قلق نہیں جاتا تھا۔ صرف عماد تھا جسے زرلالہ اور مراد کے ساتھ میں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زرلالہ کی دھمکی کو بھولا نہیں تھا۔ بلکہ اس دن کے بعد سے اس کے حواس زیادہ چوکنے تھے۔ آرزو خان کی نیک نامی کی بدولت اس کی یونیورسٹی میں جو عزت تھی، وہ اس کی غائبانہ حفاظت اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اور پھر کچھ دن بعد ہی اسٹوڈنٹ یونین کی طرف سے بک فیسٹیول ارینج کیے جانے کا اعلان ہوا۔ طلباء میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔

عباد کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی۔ بک فیسٹیول ہمیشہ سال کے اختتام پر ارینج کیا جاتا تھا اور اب یوں اچانک بے وقت اس سرگرمی کا مطلب سمجھ سے باہر تھا۔ ان ہی دنوں عباد نے مراد کو آرزو کے ڈیپارٹمنٹ کے چکر کاٹتے دیکھا۔ آرزو خان اسے جہاں دکھائی دے جاتی، وہ آس پاس منڈلانے لگتا۔ اس بات کا آرزو کو شاید اندازہ بھی نہیں تھا مگر عماد نے اس بات کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے اپنا شبہ قاسم اور

(Protected With Trial Version to Visual Watermark. Full version doesn't pull this mark.)

ذورین سے بھی شیئر کیا تھا۔ ذورین ان دنوں تازہ تازہ زرلالہ کی وجہ سے دل پر زخم کھائے بیٹھا تھا اس لیے اس نے عماد کو سارے معاملے کی تہہ تک جانے اور اندر کی خبر حاصل کرنے کا یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

خان اللہ یار خان اور زہرہ خاتون رات کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گھریلو بات چیت کر رہے تھے جب گفتگو کا رخ ولی محمد کی جانب مڑ گیا۔ اس نے نیا کاروبار شروع کیا تھا اور خان اللہ یار خان بھتیجے کی کاوشوں سے بے حد خوش تھے۔ آخر کو کل اپنی ہی بیٹی سکھی رہتی۔

اسفند نے چاولوں سے بھرا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے شوخ نظروں سے سامنے بیٹھی بہن کو دیکھا مگر ایسے نازک مواقع پر آرزو ہمیشہ طرح دے جاتی تھی۔ کبھی نظر سے نظر نہ ملاتی مبادا باپ کے سامنے ہونٹ مسکرا اٹھیں۔ اسفند نے ایک دو بار گلا کھنکھار کے اسے متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا آرزو نے ٹیبل کے نیچے سے چمچ کھینچ کر اس کے گھٹنے پر دے مارا۔ وہ بے چارہ بلبلا اٹھا۔ تب ہی فون کی بیل نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسفند تیزی سے اٹھا اور کال اٹینڈ کر کے وہیں سے آرزو کو آواز دی۔

''خور (بہن) کال ہے تمہاری۔ کوئی جویریہ بات کر رہی ہے۔''

آرزو حیران ہوتی فون تک آئی جو ڈائننگ ٹیبل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

''ہیلو۔ کون؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں مردانہ آواز سن کر وہ دنگ رہ گئی۔

''تمہارا چاہنے والا۔ دیکھو۔ دیکھو پلیز فون بند مت کرنا ورنہ میں کال کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں آرزو۔ میری نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ سارا دن یونیورسٹی میں میری نگاہیں تمہارا ہی طواف کرتی ہیں۔ تم میرے دل کی داستان سنو تو۔''

اس کی آخری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آرزو فون رکھ چکی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں بری طرح پسیج چکی تھیں۔ چہرے سے یک دم سارا خون نچڑ گیا تھا۔ زردی چھائے چہرے کے ساتھ وہ مڑی اور کپکپاتے قدموں سے بمشکل واپس کرسی تک آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی مستقل کپکپاہٹ تھی۔

سب ہی کا دھیان یک دم اس کی طرف ہو گیا تھا۔ خان اللہ یار خان کی زیرک نگاہی نے اس کی ظاہری حالت سے کسی گڑبڑ کا اندازہ کر لیا تھا اسی لیے جب فوراً ہی دوبارہ کال آئی تو انہوں نے کسی کو بھی فون اٹھانے سے منع کر دیا اور خود اٹھ کر فون تک گئے۔ ان کی ہیلو کے جواب میں نہ جانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا مگر آرزو اتنی سی دیر میں مرنے والی ہو چکی تھی۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی تھی۔ اسے نہ کچھ بجھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ ایسی سنگین صورت حال کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اس نے۔ پتا نہیں کس وقت خان اللہ یار خان واپس آ کر بیٹھے اور اسے سرد آواز میں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''آرزو۔ بچے آج کے بعد تمہارے لیے گھر پر کسی لڑکی کی بھی کال نہیں آنی چاہیے۔ تمہاری جو دوستیں تمہیں کال کرتی ہیں ان سے بھی کہہ دو کہ اب گھر کا فون خراب ہو چکا۔ یہ ان ہی لڑکیوں سے نمبر آگے سے آگے جاتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے حواس تو اس وقت ویسے ہی شل تھے۔ دماغ میں مسلسل اس لڑکے کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

اسفند ساری صورت حال بھانپ گیا تھا۔ اور اسے اس وقت آرزو کی دلی کیفیت کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے فوراً کوئی دوسرا موضوع چھیڑ کر باپ کا دھیان بٹا لیا تھا۔ زہرہ خاتون البتہ کن اکھیوں سے آرزو کے چہرے کو تک رہی تھیں جو خوف اور پریشانی کے باعث زرد ہو رہا تھا۔ انہیں اندر ہی اندر ہول سے اٹھنے لگے۔ ایک سوچ پوری شدت سے ان کے دماغ میں ابھری کہ کہیں آرزو کو مزید

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

پڑھانے کے فیصلے کو وقت ان کے گلے کا طوق نہ بنا دے۔

☆☆☆

وہ آج یونیورسٹی سے گھر جلدی واپس آ گیا تھا۔ زرلالہ کی حرکتیں اسے اب طیش دلانے لگی تھیں۔ آرزو کے لیے فکر بھی لاحق ہوتی کہ مفت میں اس کی انتقامی فطرت کا شکار ہونے جا رہی تھی۔ وہ اسے باخبر کرنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس زرلالہ کی مشکوک سرگرمیوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اسے تو پورا یقین تھا کہ مراد کے ساتھ بے وقت بک فیسٹیول ارینج کروانے کے پیچھے کوئی گڑبڑ ضرور ہے مگر اس بات کو وہ دوسروں کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ اور اب اس کا ایک ہی حل اسے سجھائی دے رہا تھا کہ عباد بھیا سے بات کرے۔ وہ یونیورسٹی کے ان ذہین اسٹوڈنٹس میں سے تھے جنہیں آج بھی یونیورسٹی کے اساتذہ اور سینئر پروفیسر زیاد کرتے تھے اور جو بھی وہ یونیورسٹی چلے جاتے تو بے حد پذیرائی ملتی تھی۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا کچن میں امی کے پاس گیا۔ ان سے مل کر وہ عباد بھیا کی اسٹڈی میں چلا آیا۔ عباد کو نئی جاب ملی تھی اور اگلے ہفتے تک جوائننگ دینی تھی۔ ابھی فی الحال فراغت تھی اس لیے زیادہ تر کتابوں کے درمیان پائے جاتے تھے۔ عماد دھیرے سے دروازہ کھول کر اسٹڈی میں داخل ہوا۔ عباد نے ہاتھ میں تھامی کتاب کے پیچھے سے اسے اچنبھے سے دیکھا۔ پھر دیوار گیر گھڑی کو دیکھا تو ابھی یونیورسٹی آف ہونے میں سوا گھنٹہ باقی تھا۔ عباد پریشانی سے فوراً سیدھے ہو بیٹھے۔

''خیریت چھوٹو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آج اتنی جلدی کیسے آ گئے گھر۔ کہیں جھگڑا تو نہیں ہو گیا کسی سے؟'' انہوں نے ایک ساتھ کتنے ہی سوال کر ڈالے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بھیا اور آپ کو پتا ہے کہ میں کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔'' وہ کچھ کچھ بے زار سا وہیں ایک کونے پر رکھے فلور کشنز کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہوا۔

''وہ تو مجھے پتا ہے لیکن انہونیوں کا دور ہے چھوٹو۔ آج کل موڈز میں ٹوئسٹ آتے دیر نہیں لگتی۔'' وہ شرارت سے بولے تو ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں مزید چمکنے لگیں۔

''سچ کہتے ہیں آپ بھیا۔ یہ واقعی انہونیوں کا دور ہے۔ لڑکے تو غنڈہ گردی کرتے دیکھے ہیں لیکن لڑکیوں کو دادا گیری کرتے کب دیکھا تھا۔'' عماد کتابوں سے بھری دیوار گیر الماری کو گھورتے ہوئے بولا۔ آواز میں آزردگی نمایاں تھی۔ عباد نے اپنی کنپٹی کھجائی اور وہی ہاتھ بالوں میں پھیر کر انہیں سنوارتے ہوئے بولے۔

''یار! بات کو کتنا گھمانا پھرانا ہے؟ بتاؤ بھی کیا ہوا۔'' عباد ٹو دا پوائنٹ بات کہنے اور سننے کے عادی تھے اس لیے عماد کو گھورتے ہوئے بولے۔

جواب میں عماد نے ساری صورت حال کھول کے رکھ دی۔ زرلالہ کی جلن اور حسد سے لے کر مراد کی کمینگی تک۔ عباد کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ خاصے وجیہہ تھے اور جب تاثرات سنجیدہ ہوتے تب ان کی شخصیت کا چارم مزید بڑھ جاتا تھا۔ عماد تو اپنے بڑے بھائی کا دیوانہ تھا۔ عباد نے آنکھیں سکوڑ کر عماد کو دیکھا اور بولے۔

''تم آرزو خان میں انٹرسٹڈ ہو عماد؟''

''انٹرسٹ اگر اس سینس میں پوچھ رہے ہیں کہ جو عام طور پر لڑکا لڑکی کے درمیان ڈویلپ ہوتا ہے تو ہرگز نہیں۔ مجھے آرزو خان میں اس طرح کا کوئی انٹرسٹ نہیں۔ میں بس اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ اتنی سلجھی ہوئی اور باحیا لڑکی ہے بھیا کہ کوئی بھی اچھے کردار کا فرد اس کی طرف دیکھنے سے پہلے دو دفعہ سوچتا ضرور ہوگا۔ لیکن یہاں زرلالہ نے سارا فساد اسے نہ دیکھ سکنے پر ہی تو ڈالا ہے۔ وہ مکمل پردہ کرتی ہے اور پہلے دن سے اب تک اس کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا۔

شروع میں زرلالہ نے دوستی کے بہانے اس

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

کے قریب ہونے کی کوشش کی بھی تو آرزو خان نے لفٹ نہیں دی۔ بس اس کے بعد سے ایک دم وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی۔ میرے ٹوکنے پر الٹا مجھے ہی پیغام دے دیا کہ اسے بے پردہ دکھا کے رہوں گی۔ اب بھی اس کے چہرے کی رعونت اور کرختگی یاد آتی ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ پتا نہیں کیوں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ اگر آپ اسے لفاظی نہ سمجھیں تو بالکل ویسے جیسے بھائی بہنوں کی کرتے ہیں۔ آپ کو پتا تو ہے کہ مجھے آج تک جو بھی لڑکی اچھی لگی، میں نے اسے بہن ہی بنایا ہے۔"

وہ اپنی بات کہتے ہوئے خود ہی ہنس دیا۔ اسے قدرتی طور پر اس رشتے سے لگاؤ تھا۔ وہ تو کبھی کبھی لاڈ میں اپنی امی کو بھی بہن بنا لیتا تھا۔

"ہم ــــ!" عباد نے ہنکارا بھرا اور پرسوچ لہجے میں گویا ہوئے۔ "تو اب تم اس سارے معاملے کو لے کر اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

"بھیا۔ آپ زرلالہ کو نہیں جانتے۔ وہ اس بک فیسٹیول کی آڑ میں کچھ نہ کچھ ایسا کرنے والی ہے جو آرزو کے لیے بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔"

"تو اب مجھ سے کیا چاہتے ہو یار۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"بھیا! آپ کسی طرح یہ بک فیسٹیول رکوا دیں۔ کچھ بھی کریں۔ اپنے پرانے تعلقات کا استعمال کریں۔ کچھ بھی۔ کیسے بھی بھیا۔"

"پاگل ہو گئے ہو عماد! بھلا میرے کہنے پر کوئی یہ فیسٹیول کیسے روکے گا۔ اور کیوں۔ کیا وجہ بتا میں گے ہم۔ ہمارے پاس ثبوت ہی کیا ہے زرلالہ کے خلاف۔ بولو؟"

عباد کی بات میں وزن تھا۔ عماد چپ سا ہو گیا۔ اسے یوں خاموش اور فکر مند دیکھ کر وہ خود ہی بولے۔

"اچھا۔ دیکھتا ہوں۔ کل چکر لگاتا ہوں یونیورسٹی کا۔ پروفیسر صدیقی کے ساتھ وائس چانسلر کے پاس آؤں گا۔ ان کو قائل کرنے کی کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ سب کرنا عبث ہوگا۔ تمہیں کوئی دوسرا راستہ دیکھنا ہوگا۔"

"مثلاً۔" عماد نے ابرو اچکا کے پوچھا۔

"آرزو تک کسی طرح زرلالہ کے عزائم پہنچاؤ۔ ہو سکتا ہے اگر اسے پتا چلے تو وہ فیسٹیول میں شریک ہی نہ ہو۔"

"کوئی فائدہ نہیں بھیا۔" عماد مایوسی سے سر دیوار گیر الماری کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"آج تیسرا دن ہے۔ چھٹی پر ہے وہ۔ اور فیسٹیول پرسوں ہے۔ اگر کل آرزو آ گئی تو بات کی جا سکتی ہے مگر قاسم نے اس کی فرینڈ سے معلوم کیا تھا۔ وہ بھی پریشان تھی۔ بتا رہی تھی کہ اس کی ادے سے بس اتنا پتا چلا ہے کہ اسے بخار ہے۔ لیکن فون پر بات نہیں ہو پا رہی۔"

"اور اتنی چھٹیوں کے بعد پرسوں اس کے آنے کے خاصے چانسز ہیں۔ رائٹ؟"

عباد کے سوال کے جواب میں اس نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔

"اچھا چلو۔ دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پرسوں میں بھی توقیر اور حیدر کے ساتھ آؤں گا۔ توقیر کی۔ مراد کے بڑے بھائی سے خاصی علیک سلیک ہے۔ وہ مراد کو دیکھ لے گا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے چھوٹو کہ یہ سب تمہارا وہم ہو۔ اس دن کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہو۔ اس لیے ٹینس مت ہو۔ کیٹس سی۔"

عباد نے تسلی آمیز لہجے میں عماد کو نارمل کرنا چاہا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا لیکن اندر اندر وہ شدید خائف تھا۔ کچھ تھا جو اسے بری طرح بے چین کیے ہوئے تھا۔ اس نے ایک نظر بڑے بھائی پر ڈالی جو اب ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے دوبارہ سے کتاب میں غرق ہو چکے تھے۔ نیوی بلیو شلوار قمیص کی آستینیں فولڈ کیے اور اوپری دو بٹن کھولے عباد کے وجیہہ چہرے کو دیکھ کر بے اختیار ایک خیال عماد کے دماغ میں سرسرایا جسے اس نے لاحول پڑھ کے جھٹک دیا۔

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

وہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی تقدیر زبان سے نکلے الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ محض خیالات ہی اس کی مہار موڑ دیتے ہیں۔

☆☆☆

زہرہ خاتون دھیرے سے دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ تین دن ہو گئے تھے آرزو کو بخار میں پھنکتے۔ آج فجر کے بعد کچھ حرارت کم ہوئی تھی اور صبح کے دس بجے تک اس کا بخار بالکل اتر گیا تھا مگر نقاہت بہت تھی۔ سارا گھر پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔

خان اللہ یار خان دن میں کئی چکر اس کے کمرے کے لگاتے اور ہر بار اس کے سرہانے بیٹھ کر ایک ہی فقرہ دہراتے۔

''تم نے کس بات کی پریشانی لی ہے میرا بچہ۔ تمہارا باپ زندہ ہے۔ تمہاری ڈھال بھی اور تلوار بھی۔ اپنے ذہن سے ہر خوف جھٹک دو۔''

خان صاحب کو اس رات آنے والی فون کال کے بعد اپنے لہجے میں چھپے شک اور درشتی پر شرمندگی تھی۔ بھلا انہیں اپنی بیٹی پر اعتبار نہیں تھا کیا؟ جس کے اعصاب اتنے نازک تھے کہ اسی رات بستر پکڑ لیا۔ مگر ان کی ہر طرح کی تسلی دلاسے کے باوجود آرزو کے اندر انجانا سا خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ رانگ کالز آنا بند نہیں ہوئی تھیں مگر اب اس کے بابا جان کی آنکھوں میں تشویش نہیں تھی۔ بس اسی کے اندر وسوسے پنجے گاڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے ان تین دنوں میں سہیلیوں کی آنے والی کالز بھی اٹینڈ نہیں کی تھیں۔ اس کا جی تو یونیورسٹی سے بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔

''اٹھ گئی میری لور (بیٹی)۔ اس وقت تو ماشاء اللہ طبیعت بہت بہتر لگ رہی ہے میری جان کی۔''

آرزو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ زہرہ خاتون محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتیں اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں اور ناشتے کی ٹرے آرام سے اس کی گود میں رکھ دی۔

''نہیں دے۔ میرا جی نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کھانا۔'' آرزو نے بے زاری سے ٹرے پرے کرنا چاہی تو زہرہ خاتون نے اسے گھرکا۔

''جی ہے یا نہیں۔ کھانا پڑے گا۔ تمہارے دا جی نے کہا ہے کہ شام تک ان کی لاڈلی بالکل ٹھیک ٹھاک انہیں کمرے سے باہر چاہیے۔ چل میرا بچہ۔ کھا لے تھوڑا سا۔'' اب وہ اسے پچکار رہی تھیں۔

آرزو نے بے دلی سے ابلے ہوئے انڈے کا لقمہ لیا۔ زہرہ خاتون کا جی بھر آیا۔ کیسے تین دن میں پیلی پڑ گئی تھی اس کی رنگت۔ انہوں نے پیار سے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے اور بولیں۔

''اپنے دا جی سے ناراض نہ ہو میری گڑیا۔ میں تمہاری ماں ہوں، مجھے معلوم ہے کہ تم اندر ہی اندر ان کی بے اعتباری پر ان سے خفا ہو۔ مگر یہ مت بھولو کہ وہ کیا ہیں اور کون ہیں۔ وہ مرد ہیں آرزو۔ انہوں نے سب سے ٹکر لے کر تمہیں اس تعلیمی ادارے میں بھیجا ہے۔ انہیں تم پر پورا بھروسا ہے مگر حالات پر نہیں۔ اور پھر پہلی بار آرزو۔ پہلی بار اس گھر میں ایسی رانگ کال آئی تھی۔ ان کو غصہ آنا قدرتی امر تھا۔''

''دے۔ مجھے اب یونیورسٹی نہیں جانا۔ میرا جی پلٹ گیا ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولی تو زہرہ خاتون نے اس کی ٹھوڑی تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

''آرزو۔ بیٹا! تمہاری وجہ سے ہمارے خاندان کی کتنی ہی بچیوں کے لیے پڑھنے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ اب اگر تم ہی جی چھوٹا کر لو گی تو سب اس بات کو غلط معنی پہنائیں گے۔ اس ٹوہ میں لگ جائیں گے کہ آخر ایسا کیا ہوا جو تمہیں اچانک سے پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ تمہارے دا جی کس کس کو صفائیاں دیتے پھریں گے۔''

اس کے اترے چہرے پر نیم رضامندی دیکھتے ہوئے زہرہ خاتون نے اس کا ہاتھ تھام کر ہلکی چوٹی اور کہنے لگیں۔

''تمہاری سہیلی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

پرسوں کوئی کتابوں کا فنکشن ہے تمہاری یونیورسٹی میں۔"

"کتابوں کا فنکشن نہیں ادے۔ بک فیسٹیول ہے۔" آرزو کو لفظ فنکشن پر ہنسی آ گئی۔ زہرہ خاتون بھی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

"دیکھ۔ جیسے چاند کو گدگدا دیا ہو، ایسے ہنستی ہے میری پری۔ اب کل کا دن مزید آرام کرو اور پرسوں سے یونیورسٹی جاؤ۔ ٹھیک؟"

آرزو نے تھک کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ زہرہ خاتون اس کی پیشانی چوم کر اٹھیں اور اس کا کمرہ سمیٹنے لگیں۔

آرزو خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اس لڑکے کی آواز اب بھی بازگشت بن کر اس کے دماغ میں چکراتی تھی اور اسے اذیت کے احساس سے دوچار کر دیتی تھی۔ آرزو کے دل میں بیٹھا خوف اسے کسی انہونی کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ زہرہ خاتون کو اندازہ ہوتا کہ وہ اپنی لور کو پرسوں کے بعد ساری عمر کے لیے کھو دیں گی تو اسے ہمیشہ کے لیے سینے میں چھپا لیتیں مگر کچھ انہونیاں، ہونے کے لیے ہوتی ہیں۔

☆☆☆

وہ تینوں متفکر سے کینٹین میں بیٹھے تھے جو اس وقت تقریباً خالی پڑی تھی۔ بک فیسٹیول کا اہتمام خاصے بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا اور ساری یونیورسٹی جیسے وہیں گراؤنڈ میں امڈ آئی تھی۔ عماد کو شدت سے آرزو کا انتظار تھا جو ابھی تک کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

بھیا نے اسے کہا تھا جیسے بھی ہو وہ تینوں اس کے آس پاس رہیں جب تک ساری صورت حال سمجھ میں نہ آ جائے۔ عباد تو عماد بھیا کا بھی انتظار کر رہا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ وہ فیسٹیول شروع ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے مگر ابھی تک ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ قاسم کسی سوچ میں گم کینٹین کے ٹیبل کا فارمیکا ادھیڑ رہا تھا جو پہلے ہی ذرا سا اکھڑا ہوا تھا۔ اکتائے بیٹھے ذوریز نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر چپت مار کر اس کا ہاتھ پرے جھٹکا اور خود اسی توجہ اور شوق سے فارمیکا چھیلنے بیٹھ گیا۔ عماد کو اس کی حرکت پر ہنسی آ گئی۔ تب ہی اسے دور سے عباد بھیا آتے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلے ہی اسے ڈھونڈتے اس طرف آ رہے تھے۔ وہ تینوں ان کے استقبال کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی آ تو گئی تھی مگر اس کے دل کو پنکھے لگے تھے جیسے۔ گھبراہٹ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جی میں آ رہا تھا کہ ابھی کلریکل آفس جائے اور گھر کال کر کے اسفند کو بلوا لے۔ اسی شش و پنج میں وہ بھیڑ سے بچتی بچاتی سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے باہر وہیں آ کر بیٹھ گئی جہاں ان کا گروپ بیٹھا کرتا تھا۔

ثیما سے بات ہوئی تھی تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ لوگ یہیں اکٹھی ہوں گی مگر ابھی تک وہاں کوئی بھی نہیں آئی تھی۔ اکا دکا اسٹوڈنٹ آس پاس دکھائی دے رہا تھا ورنہ سارا ڈیپارٹمنٹ سنسان پڑا تھا۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اپنا نقاب ٹھیک کرتی وہ کھڑی ہوئی اور بیگ کو کندھے پر ڈال کر وہاں سے جانے ہی لگی تھی جب اسے کسی نے پکارا۔

"ایکسکیوزمی۔ آپ آرزو خان ہیں نا؟"

آرزو پلٹی اور پکارنے والی کا چہرہ دیکھا۔ یہ سینئر اسٹوڈنٹ تھی اور شائد فزکس ڈیپارٹمنٹ کی تھی۔ اس نے تائید میں سر ہلایا تو وہ لڑکی عجلت میں بولی۔

"آرزو! تمہارا پورا گروپ وہاں آڈیٹوریم میں بیٹھا ہے۔ سب وہیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم کہیں دکھائی دو تو تمہیں بتا دوں۔"

آرزو کی جان میں جان آئی۔ وہ تھینکس کہہ کر تیزی سے آڈیٹوریم کی جانب بڑھی۔ کچھ اتنے دن بخار رہنے کی وجہ سے نقاہت تو کچھ تیز تیز چلنے کی وجہ

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

سے اس کا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہو کر سیدھا ایک کرسی کی جانب بڑھی اور اس پر بیٹھ کر آنکھیں موند کر تیز تیز سانس لینے لگی۔

اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سماعت اور بصارت پر پردہ سا پڑ گیا ہے۔ کچھ پل لگے اسے حواس بحال کرنے میں۔ آنکھوں کو چادر کے پلو سے رگڑ کر اس نے ارد گرد دیکھا تو پورا ہال خالی پڑا تھا۔ خالی کرسیوں کا ڈھیر تھا جو آپس میں بے ڈھنگے انداز میں گتھم گتھا ہوئی پڑی تھیں۔ یوں جیسے انہیں کسی نے آڑ کے لیے ایسے رکھ دیا ہو۔ اس کا دل ایک بار ڈوب کر ابھرا۔

وہ ایک لمحہ بھی مزید ضائع کیے بغیر کھڑی ہوئی اور واپس دروازے کی طرف منہ پھیرا تو پیروں میں سے جان نکل گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اور یقیناً غیر محسوس انداز میں باہر سے بند کیا گیا تھا۔ نقاب کے پیچھے اس کے ہونٹ مارے خوف کے ایک دوجے سے چپک کر رہ گئے۔ اسے خیال آیا کہ یہاں محض یہی ایک دروازہ نہیں ہے۔ وہ تیزی سے دوسرے دروازے کی سمت آئی تو وہ بھی بند تھا۔ تیسرا جو ہال کی پچھلی جانب تھا وہ ویسے ہی مستقل بند رہتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کے ساتھ کسی کی بھی کچھ غلط کرنے کی پلاننگ تھی تو ایسا کچھ بھی ہونے سے پہلے وہ خود کو ختم کر لے گی۔ اس کے شل ہوتے دماغ میں اس رانگ کالر لڑکے کی آواز لہروں کی مانند پھرنے لگی۔

"کوئی ہے۔ مجھے یہاں سے نکالو۔ شیما۔ ربیعہ۔ زرمین۔ کوئی ہے؟" وہ پورے زور سے چلائی۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو سیلاب بن کے امڈ پڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ چلاتی، اس کے پیروں میں کوئی چیز زوردار آواز کے ساتھ آ کر گری۔

"پٹاخ۔"

ایک اور۔ پھر ایک اور۔ اور پھر اس کے پیروں کے پاس مسلسل پٹاخے پھوٹنے لگے، وہ خود کو بچاتی، چیخیں مارتی کبھی ایک جانب اچھلتی تو کبھی دوسری طرف۔ ایسی بدترین صورت حال کا وہ کبھی زندگی میں تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے ڈھیلے ہوتے نقاب کو ٹھیک کیا اور ایک بار پھر دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔ جلتے اچھلتے پٹاخوں کی پٹی یک دم کسی نے اس کے پیروں کے بیچ اچھالی اور اب کے اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ کوئی پل جاتا تھا کہ وہ گر کر بے ہوش ہو جاتی مگر اس کے مختل حواس جھنجھنا اٹھے جب اس کی لمبی چادر کے فرش کو چھوتے کونے پر یکے بعد دیگرے کئی پٹاخے آ کر گرے اور ان کی چنگاریوں سے اس کی چادر نے آگ پکڑ لی۔

موت اس کی آنکھوں کے سامنے رقصاں تھی اور وہ بے بس سی خود اپنا ہی تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سب گھر والوں کے چہرے پھرنے لگے۔ خوف کی شدت نے آواز بھی بند کر دی تھی۔ اس کے پاس محض چند لمحات تھے جن میں وہ فیصلہ کرتی، آیا اسے اپنی چادر تن سے الگ کر دینی چاہیے یا یونہی موت کو گلے لگا لے۔ چادر اتار پھینکتی تو اسے بچانے اگر کوئی آتا بھی تو بے پردگی کی حالت میں دیکھتا اور کیا پتا کہ آنے والوں کی تعداد کتنی ہوتی؟ چند پل میں اس نے تمام حساب کتاب کر کے یہ فیصلہ کیا کہ یوں تو پھر یوں ہی سہی۔

وہ سمٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ آگ تیزی سے اس کی چادر کا پلو جلاتی اوپر بڑھتی آ رہی تھی۔

قدرت مہربان ہوئی اور چند سیکنڈز کے توقف پر ہال کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔ یوں جیسے کسی نے دھکے مار مار کر اسے کھولا تھا۔ اس نے چہرہ نہیں اٹھایا تھا، اس پر جیسے ہلکی سی غشی طاری ہو گئی تھی۔ یک دم ارد گرد کئی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور پھر کسی نے اس کی جلتی چادر کو اپنی جیکٹ اتار کر اس سے بجھانے کی کوشش کی، وہ جو کوئی بھی تھا ساتھ ہی ساتھ اپنے ہاتھوں کا بھی استعمال کر رہا تھا۔

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

آرزو ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اس کے سن ہوتے دماغ نے اپنے اردگرد ڈیپارٹمنٹ ہیڈز اور بہت سے اسٹوڈنٹس کی آوازیں سنیں۔ سب ہی اسٹوڈنٹس اشتعال میں شور مچا رہے تھے۔

''ماریں انہیں۔ ماریں سر۔ ان لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی۔ مراد ہائے ہائے۔ مراد مردہ باد۔ مارو انہیں۔''

دھڑا دھڑ کرسیاں گھسیٹی جا رہی تھیں اور وہ جو اوپر تلے پڑی کرسیوں کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی تو ان کے پیچھے ہی وہ تمام آلہ کار چھپے ہوئے تھے جنہوں نے اس کے ساتھ یہ مذموم حرکت کی تھی۔ ان سب کو اسٹوڈنٹس زدوکوب کرتے باہر لے کر جا رہے تھے۔ وہ سب کو سن رہی تھی، سب با آواز بلند یہ کہہ رہے تھے کہ یہ سب کچھ مراد اور اس کے چیلوں کی حرکت ہے۔ ان ہی میں سے کسی نے زرلالہ کا نام بھی لیا تھا۔ مگر وہ اس قدر خوف زدہ تھی کہ سر اٹھا کر سب کو دیکھنے تک کی ہمت کھو چکی تھی۔ یہ صدمہ الگ تھا کہ اس کے ساتھ آخر یہ سب کیوں کیا گیا؟ اس نے کسی کو کیا کہا تھا؟

''ایکسکیوز می۔ مس آرزو۔ آپ اٹھیے پلیز۔ آپ اب سیف ہیں۔ میں آپ کو گھر پہنچانے کا انتظام کرتا ہوں۔ پلیز اٹھیں۔''

عباد لودھی اس کے قریب بیٹھے نرمی سے کہہ رہے تھے مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

''اللہ نے آپ کی حفاظت فرمائی ہے۔ آپ پر شکر واجب ہے۔ گھر جا کر آپ یہ کام لازمی کیجیے گا۔''

اتنی مہربان اور نرم آواز پر آرزو کا دل موم بن کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ اس نے زار و زار روتے ہوئے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ عباد کو دیکھا۔ نیلگوں سمندر میں تلاطم زوروں پر تھا اور عباد لودھی کا دل بری طرح ڈول گیا۔ اس کی نیلی آنکھیں اتنی خوب صورت تھیں کہ کوئی بھی ان کی گہرائی میں اتر کر ابھر نہ سکے۔

وہ دھیرے سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کھڑی ہوئی تو اس کی چادر جو آدھی سے زیادہ جل چکی تھی، اس کا ایک جلا ہوا کونا پیر کے نیچے آ گیا۔ ذرا سا کھچاؤ آیا اور نقاب سرک کر چاہ ذقن تک اس کے نقوش کی جھلک دکھلا گیا۔ عباد نے ایک جھلک دیکھی اور فوراً منہ پھیر لیا۔ کہکشاؤں کے اسرار۔ تاروں کی تابناکی۔ چاند کا اجلا پن۔ دن کا اجالا اور شبنم کے قطرے کی پاکیزگی۔ یہ تمام استعارے یکجا ہو جائیں تو آرزو خان کے حسن کی تشریح ہوتی تھی۔

آرزو نے فوراً اپنا نقاب ٹھیک کرنے کے بعد تاسف اور صدمے سے اپنی چادر کی حالت دیکھی۔ وہ گھر کیسے جائے گی۔ کیا کہے گی؟ یہ سوال اس کی ذہنی حالت کو مزید مخدوش کر گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا ڈولتا سر تھاما اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ عباد کو اس کی سچویشن کا اندازہ تھا۔ انہوں نے اپنی جیکٹ اس کے حوالے کی اور بولے۔

''فی الحال یہ پہن لیں۔ چادر اتنی زیادہ جل چکی ہے کہ آپ اس سے خود کو مکمل نہیں ڈھانپ سکتیں اس لیے آپ اپنا چہرہ ڈھکیں اور میری یہ جیکٹ پہن لیں۔ کم از کم آسانی سے گھر چلی جائیں گی۔'' آرزو نے ایک نظر اس تاڑ سے لمبے مرد کو دیکھا اور دوسری نگاہ جیکٹ پر ڈالی تو اسے تسلی ہوئی۔ اتنی بڑی جیکٹ تھی کہ اس میں وہ کیا، اس جیسی دو اور آ جاتیں۔ جیکٹ پہن کر وہ عباد کے ساتھ ہی اس سے دو قدم پیچھے چلتی ہال سے باہر آ گئی۔ اسے لگا جیسے قبر سے نکلی ہو۔

یہ اس کی زندگی کا خوف ناک ترین وقت تھا۔ اب وہ کچھ مطمئن تھی اور آہستہ قدموں سے چلتی کاریڈور عبور کر رہی تھی جب اسے سامنے سے زرلالہ بلوچ آتی دکھائی دی۔ اس کی چال میں غضب کا اعتماد تھا۔ رو رو کے آرزو کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں یا پھر اس کی بصارت دھوکا کھا رہی تھی۔ اسے زرلالہ کے پیچھے خان اللہ یار خان اور ولی محمد کے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ موت سے پہلے کوئی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

نہیں مرتا لیکن موت کو محسوس کرنا کیا ہوتا ہے، یہ آرزو نے جان لیا تھا۔ زمین اب کسی کے لیے شق تھوڑی نہ ہوتی ہے ورنہ دنیا کی آدھی بیٹیاں خود دفن ہو چکی ہوتیں۔

خان اللہ یار خان قریب آ کر ٹھہر گئے۔ انہوں نے بے حد سرد اور سپاٹ نظروں سے عباد لودھی کو دیکھا۔ عباد اندر ہی اندر اس صورت حال پر پریشان ہوا اٹھے تھے۔ یہ سب تو ان کے حق میں بھی اچھا نہیں تھا۔ اسے آنے والوں کے تیور بہت کچھ باور کرا رہے تھے۔ ادھ موئی آرزو کا جی چاہا کہ بھاگ کے اپنے دادی کے گلے لگ جائے اور ان کے سینے میں منہ چھپا کے خود پہ بیتی ساری افتاد کہہ ڈالے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی لیکن خان اللہ یار خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا۔ اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے۔ اس نے زرلالہ کے چہرے کو جانچا تو وہاں رقصاں شیطانی مسکراہٹ اس کی کارگردگی کا پتا دے رہی تھی۔ خان صاحب نے تنفر سے بیٹی کے بے حال وجود پر ایک نگاہ ڈالی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں فون پر جو اطلاع دی گئی تھی وہ بالکل درست تھی۔

☆☆☆

ناسازیٔ طبع کے باعث آج وہ گھر پر ہی موجود تھے۔ انہوں نے اسفند کو کالج سے چھٹی کروا کے فیکٹری بھیجا تھا۔ ولی محمد کو معلوم ہوا تو ماں کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گھر پہنچ گیا۔ ہونے والے داماد اور بھتیجے کو دیکھ کر ویسے ہی ان کا خون بڑھ جاتا تھا۔ وہ سب بے حد اچھے ماحول میں باتیں کر رہے تھے جب فون کی بیل ہوئی۔ خان صاحب کے کال اٹینڈ کرنے پر آگے سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو انکل۔ دیکھیں۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن میں آپ کی خیر خواہ ہوں۔ آپ کی بیٹی اس وقت آڈیٹوریم میں کسی لڑکے کے ساتھ بند ہے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، آپ پلیز یونیورسٹی آ جائیں اور اپنی عزت بچا لیں۔ میں آپ کو خود گیٹ پر ریسیو کر کے وہاں تک لے جاؤں گی۔ یہ لڑکا آرزو کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہے، بس بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، آپ یہاں آ جائیں۔''

یہ کال نہیں تھی۔ خان اللہ یار خان کی موت کا مژدہ تھا۔ جو بیٹی ان کا غرور تھی، وہی ان کا شملہ آڈیٹوریم کے بند دروازوں کے پیچھے اچھال رہی تھی۔ ان کی آنکھیں یک دم خون رنگ ہوئیں۔ جسم میں طیش کی وجہ سے کپکپاہٹ اس قدر تھی کہ دو قدم اٹھانا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

ولی محمد کو صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا، اس نے ان کا ہاتھ تھام کر گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیو کرتا ہوا یونیورسٹی پہنچا۔ وہاں گیٹ پر ہی انہیں زرلالہ مل گئی جو انہیں یہاں تک لے آئی تھی۔ کیونکہ پلان کے مطابق اگر عباد یہاں نہ آتے تو ساری یونیورسٹی کے سامنے بے حجاب آرزو خان اور مراد ہال میں سے برآمد ہوتے۔ جو اپنے یار دوستوں کے ساتھ کرسیوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔

جس وقت آرزو ہال میں داخل ہوئی، زرلالہ نے بنا آواز باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس سے پہلے فزکس ڈپارٹمنٹ کی امرہانی کے ذریعے جھوٹ کہلوا کے وہ آرزو کے سارے گروپ کو لائبریری کی طرف روانہ کر چکی تھی کہ وہاں آرزو ان کا انتظار کر رہی ہے اور آرزو کو یہ کہا گیا کہ اس کا گروپ آڈیٹوریم میں اس کا منتظر ہے۔

یوں بڑی مہارت سے زرلالہ، آرزو کو وہاں لانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مراد اور اس کے ساتھیوں نے آرزو پر پٹاخے پھینک کر اسے بری طرح ہراساں کیا اور پھر آخری حربے کے طور پر مراد نے پٹاخوں کی پٹی اس کی چادر پر اچھال دی۔ اسے یقین تھا کہ بوکھلائی ہوئی آرزو کسی بھی لمحے اب اپنی چادر اتار پھینکے گی مگر اگلے ہی پل اس نے آرزو کی آنکھوں میں مصمم ارادے کی چمک دیکھی۔ وہ ڈھیلی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

ہو کر وہیں دیوار کے ساتھ کندھا ٹیکے، گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھتی چلی گئی۔

مراد مارے غضب کے بل کھا کر رہ گیا۔ اتنا کھڑاگ کیا تھا اور اب کیا اس حسن کی مورت کو دیکھنا بھی نا؟ وہ خود اس کی چادر نوچ لینے کے ارادے سے اس کے قریب جانے ہی والا تھا۔ مگر عباد کی بے وقت آمد نے اس کا سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ آرزو خان کو دیکھنے کی حسرت بھاپ بن کے اڑ گئی۔

عباد کے پیچھے اسٹوڈنٹس اور پروفیسرز کا جتھا تھا۔ اس کے ایک ساتھی نے باہر سے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور وہ اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر خود تیزی سے پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ مگر زرلالہ کا کھیل ابھی باقی تھا۔ اس کے سارے مہرے نہیں پٹے تھے اور اب وہ آرزو خان اور عباد لودھی کے سامنے اپنی آخری چال لیے کھڑی تھی۔

عباد چند قدم آگے بڑھے اور خان اللہ یار خان کو صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ آج شام تک اپنے گھر کے بڑوں کو لے کر نکاح خواں کے ساتھ میرے گھر آؤ اور اپنا گند سمیٹ کے لے جاؤ۔ ورنہ کل صبح کا سورج تم دونوں کو دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے ولی محمد کو اشارہ کیا اور بولے۔" اسے لے کر آؤ ولی محمد۔ شکر کرنا کہ یہ غلاظت تمہارا مقدر نہیں بنی۔"

خان اللہ یار خان واپس مڑے اور تیز قدموں سے چلتے چلے گئے۔ پیچھے پتھر ہوئی آرزو کچھ دیر پہلے خود پر بیتے اتنے بڑے سانحے پر ہوش و خرد سے بیگانہ نہیں ہوئی تھی مگر باپ کے الفاظ نے اس کے بدن سے روح نوچ لی تھی جیسے۔ اس کے داجی نے اسے گند کہا تھا۔ غلاظت بولا تھا۔ لیکن کیوں؟ اس نے کیا ہی کیا تھا آخر؟

اس کے تھکے ہارے اعصاب کے لیے یہ وار کاری تھا۔ وہ قدم بہ قدم دور ہوتے خان اللہ یار خان کی پشت کو تکتی زمین بوس ہو گئی تھی۔ اپنی جگہ ساکت و بے یقین کھڑے عباد لودھی نے ایک نظر بے ہوش پڑی آرزو پر ڈالی اور دوسری ولی محمد پر، جو خود سر دونوں ہاتھوں میں گرائے پریشانی کے عالم میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ عباد کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ یہ کیسی کایا پلٹی تھی یک دم۔ اچھی بھلی پرسکون زندگی ہچکولوں کی زد پر آ گئی تھی۔ بھلا کوئی باپ یوں بھی کرتا ہے۔ نہ صفائی کا موقع دیا اور نہ اس سے وضاحت مانگی، بس آناً فاناً سولی چڑھانے کا فیصلہ صادر کر کے چلتے بنے۔

وہ بے بسی سے آرزو کے لاچار وجود کو تک رہا تھا اور اس کی پشت پر زرلالہ ششدر سی آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔

ایسا تو اس کے پلان میں شامل ہی نہیں تھا کہ آرزو خان کو عباد لودھی سے ہی بیاہ دیا جائے۔ وہ عباد جو اس کا خواب تھا۔ وہ عباد جو اس کی پہلی اور آخری خواہش تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ آرزو کے بابا اس صورت حال پر حواس باختہ ہو کر اس کا نکاح ہنگامی بنیادوں پر اس کے منگیتر سے ہی کر دیں گے یا دوسری صورت میں مراد دل تھال میں رکھے بیٹھا تھا آرزو کے لیے۔ مگر عباد کو کھو دینے کا تو اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ بھلے سے وہ اسے نہیں چاہتا تھا مگر کب تک۔ اسے یقین تھا کہ ایک نا ایک دن بالآخر وہ اسے رام کر ہی لے گی۔

محبت میں خلوص اولین شرط ہے لیکن زرلالہ کو محبت تھی ہی کب۔ عباد بھی اس کی ضد تھا اور آرزو خان بھی۔ آرزو کو نیچا دکھانے کے چکر میں آج اس نے عباد کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

☆☆☆

کیلیفورنیا کی شام اپنے ساتھ دھند کی دبیز تہہ لے کر اتری تھی۔ یسار نے آتش دان کو مزید سلگانے کے لیے اس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ڈالیں اور دوبارہ سے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ابھی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

وہ تیسری بار کافی بنا کر لایا تھا۔ عباد لودھی نے آج ماضی کی پرت در پرت اس کے آگے کھول کر رکھ دی تھی۔ عباد لودھی کے لیے آج بھی وہ وقت یاد کرنا اسی قدر تکلیف دہ تھا جتنی اذیت انہیں اس سے محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی سالوں کی نیک نامی کو پل بھر میں دھول چٹا دی گئی تھی۔ لمحوں میں خان اللہ یار خان کا فیصلہ، خبر بن کر پوری یونیورسٹی میں بازگشت کرنے لگا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ دونوں بے قصور ہیں مگر پھر بھی انہیں سب کی نظروں میں سوال دکھائی دے رہے تھے۔ بہت سے پروفیسرز اور وائس چانسلر نے اس معاملے کو خود آرزو کے گھر جا کر نمٹانے کی پیش کش کی مگر عباد نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ خان صاحب کے اطوار سے جان چکا تھا کہ وہ اپنے فیصلے سے ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔

اور اسی شام عباد اپنی والدہ، عماد اور نکاح خواں کو ساتھ لے کر آرزو کے گھر پہنچ گئے تھے۔ خان اللہ یار خان نے ان کے استقبال کے لیے باہر آنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان تینوں کو لان میں رکھی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور اگلے آدھے گھنٹے میں آرزو کے بھائی اسفند کی موجودگی میں عباد اور آرزو کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ اسفند اس موقع پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا تھا۔ اس کی اتنی لاڈلی حور یتیموں کی طرح اس تا حیات بندھن میں بندھ گئی تھی۔ وہ بار بار عباد کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا مگر گلے میں اٹکے آنسوؤں کے پھندے کی وجہ سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔

پوری کوٹھی جیسے سوگ میں ڈوبی تھی۔ کونے کھدروں میں کھڑے ملازم بھی آنسو بہا رہے تھے۔ چند منٹ بعد اسفند سر تا پا سفید چادر میں ملفوف کوئی لاش سی ساتھ لگائے گھسیٹتا آیا۔ اس نے بہن کا سر کئی بار چوما۔ سینے سے لگایا۔ وہ رو رو کر معافیاں مانگ رہا تھا مگر بے اختیار تھا۔ آرزو کے منجمد وجود میں رتی جنبش نہیں ہوئی اور وہ اتنی ہی خاموشی کے ساتھ عباد کے سنگ رخصت ہو گئی۔

جس گھڑی عباد کی والدہ نے اسے محبت سے تھام کر گاڑی میں بٹھایا تھا، عین اس پل کوٹھی کے اندر سے تیز زنانہ چیخ کی آواز سنائی دی۔ کوئی عورت بلک بلک کر آرزو کو پکار رہی تھی۔

پورے وقت میں واحد یہ گھڑی ایسی تھی جو آرزو کے مردہ تن پر اثر انداز ہوئی تھی۔ عباد نے گود میں دھرے اس کے مرمریں شفاف ہاتھوں پر پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے دیکھے۔ انہیں شدید اذیت ہوئی۔ قسمت نے ان دونوں کے ساتھ عجب ہی کھیل کھیلا تھا۔ انہوں نے چپکے سے اپنا ہاتھ آرزو کے سرد ہاتھ پر رکھ کر دبایا، یوں جیسے دلاسا دیا ہو۔ آرزو نے اپنا ہاتھ واپس نہیں کھینچا تھا کیونکہ اس کی تمام کشتیاں جل چکی تھیں۔ اب جو تھا یہی تھا۔ جیسا تھا، گوارا تھا اور سہارا تھا۔

عباد نے ایک طویل سانس بھری اور سر صوفے کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موندتے ہوئے آسودہ سے گویا ہوئے۔

''یہ تھا وہ چھل جس کا شکار تمہارے نانا ہوئے اور انہوں نے اپنی سب سے قیمتی متاع میری جھولی میں ڈال دی اور یقین مانو، کہ تمہاری ماں کو پا کر مجھے احساس ہوا کہ یہ حور اللہ نے چونکہ مجھے دنیا میں ہی دینا تھی اس لیے وہ سب کچھ ہوا، ورنہ دوسری صورت میں تو آرزو مجھے کبھی مل ہی نہیں سکتی تھی۔ میری کسی نیکی کا انعام ہے آرزو۔ میری ہر آرزو کی آرزو ہے۔ یہ چھل میری کل زیست کا پھل ہے۔''

وہ شرارت سے بولتے یسار کو بڑے پیارے اور نٹ کھٹ سے لگے۔ اس نے باپ کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی کی پشت کو عقیدت سے چوم لیا۔

''آئی لو یو بابا۔'' عباد نے آگے جھک کر اس کا گھنے بالوں والا سر چوما اور محبت سے بھینچ لیا۔

''بابا۔ دادی تو چلیں ناراض ہو گئے۔ تو کیا ماموں اور نانی نے بھی ماما سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' اس نے یک دم سر اٹھا کر سوال کیا۔

''ہم جب تک پاکستان میں رہے، تمہارے

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

ماموں نے ایک دو بار رابطہ کیا تھا لیکن تمہاری نانی، تمہارے نانا کے حکم کی پابند تھیں، وہ بیٹی کو یاد کر کر کے روتی تھیں۔ زینیا کی پیدائش پر کسی کے ہاتھ چوری چھپے بہت سا سامان بھجوایا تھا تمہاری نانی نے مگر تمہاری ماما نے واپس کر دیا۔ اس کے بعد وہاں سے دوبارہ کوئی نہیں آیا پھر ہم یہاں آ گئے۔ میں نے بھی پیچھے ایسا کوئی رشتہ نہیں رہنے دیا تھا جس کی تڑپ مجھے واپس پاکستان پلٹنے پر مجبور کرتی۔ تمہاری دادی ہمارے ساتھ ہی آئی تھیں اور کچھ ہی ماہ بعد تمہارے چاچو بھی اپنی جاب چھوڑ کر یہیں آ گئے، یوں بہت سے چیپٹرز کلوز تو ہو گئے مگر یہ جو خونی رشتے ہوتے ہیں نا، یہ زندگی کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔ ذرا سا وقت گزرتا ہے تو ان کی کشش انسان کو بے حال کر دیتی ہے۔

تمہاری ماما یہاں آنے کے بعد بھی اکثر اکیلے میں رویا کرتی تھیں۔ تمہارے ماموں اسفند بہت پیارے انسان تھے اور آرزو سے بے حد پیار کرتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح یہاں کا نمبر حاصل کر لیا مگر تمہارے نانا کو یہ بات معلوم ہو گئی۔ انہوں نے تمہارے ماموں کو قسم دے کر آرزو سے رابطہ کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن اسفند نے آخری دفعہ آرزو کو کال کر کے ساری بات بتا دی۔ پھر اس کے بعد وہ کبھی کال نہ کر سکا۔

تمہاری ماما یہاں سے دن میں کئی کئی بار پاکستان اپنے گھر فون کرتی تھیں اور کبھی تمہاری نانی اٹھا لیتیں، کبھی نانا تو ان کی آواز سن کر فون رکھ دیتی تھیں۔ یوں بہت سا وقت گزرتا چلا گیا یہاں تک کہ آج تمہارے ماموں اسفند کے مرنے کی خبر مل گئی مگر انا کا پرچم اتنا ہی سربلند ہے جتنا پہلے دن تھا۔ کتنا کچھ ہو گیا۔ میرا بھائی نہ رہا، آرزو کا بھائی چلا گیا اور اب جب اپنا بھی وقت سر پر کھڑا ہے تب بھی یہ رنجشیں ویسی ہی تر و تازہ ہیں۔ ان کی ہریالی نے خون سفید کر دیے۔ زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہارے نانا نے ساری عمر کے لیے ایک غلط فہمی کے پیچھے بیٹی جیسے پیارے رشتے کو دور کر دیا۔"

عباد صاحب نے بات مکمل کر کے بے حد آزردہ دلی سے صوفے سے سر ٹیک کر نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ یسار جانتا تھا کہ کبھی بھولے سے بھی عماد چاچو کا ذکر ہو جاتا تو وہ یونہی پل بھر میں جیسے بچھڑ جاتے تھے۔ آج سے قریباً تیرہ سال پہلے عماد لودھی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ائیر کریش حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ عماد کی بیوی مراکش سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنی بیوی کو ان کے ماں باپ سے ملوانے مراکش لے جا رہے تھے جب ان کا طیارہ لینڈنگ سے پہلے ہی کریش ہو گیا۔ سب پسنجرز مارے گئے تھے۔ حسان، عماد لودھی کا ہی بڑا بیٹا تھا جو فائنل ایگزامز کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اپنے بڑے بابا کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ یسار اور وہ ایک ہی اسکول اور کلاس میں تھے۔ اور تب سے ان کے گھر آیا حسان لودھی پھر کبھی واپس نہیں جا سکا تھا۔ وہ اتنے بڑے حادثے کے بعد جیسے گونگا ہو گیا تھا۔ شاک کے زیر اثر وہ کئی ماہ تک سب سے کٹ کر کمرے میں بند رہتا تھا۔ عماد کی موت عباد صاحب کے لیے جانکاہ صدمہ تھی مگر انہوں نے حسان کو اس فیز سے نکالنے کے لیے بڑی محنت کی۔ آرزو اور دونوں بچوں نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

آرزو اسے اپنی اولاد کی طرح پہلے بھی چاہتی تھیں اور اب تو مزید اس پر ممتا نچھاور کرنے لگی تھیں۔ زینیا اور یسار گھر میں حسان کی اہمیت سے خائف ہونے کے بجائے جی جان سے اس کا دل بہلائے رکھتے۔ یوں کچھ وقت لگا مگر حسان اس ٹراما سے باہر نکل آیا۔ یسار اور حسان کی بہت بنتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے۔ ان دونوں نے رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے شوق تک اپنا لیے تھے۔ یسار کو جنون کی حد تک باسکٹ بال پسند تھا، حسان نے بھی کرکٹ چھوڑ کر باسکٹ بال کھیلنا شروع کر دیا۔ حسان کو ہائیکنگ کا شوق تھا، اس کی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

دیکھا دیکھی یسار نے بھی یہ شوق پال لیا۔ دونوں کے مزاج میں تضاد ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے مزاج کو خود پر اوڑھے ہوئے تھے۔

یسار بیٹھے بیٹھے سوچ کا گھوڑا دوڑاتا کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ اس نے ایک نظر عباد لودھی پر ڈالی تو وہ صوفے کی بیک سے سر ٹیکے اونگھ رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں اٹھا اور اندر سے جا کر ہلکا سا کمفرٹر اٹھا لایا۔ ان کی ٹانگوں پر ڈالنے کے بعد وہ خود کچھ دیر کے لیے اپنے روم میں چلا آیا۔

دل کو عجیب سی بے چینی تھی۔ اسے اپنے نانا پر بے حد غصہ بھی آ رہا تھا۔ آج ان کی بے حسی کی وجہ سے اس کی ماما بیمار تھیں۔ کیا تھا جو انہیں اکلوتے بھائی کے مرنے کی اطلاع دے دی جاتی۔ یک دم اسے پھر سے سلسبیل پر تاسف ہوا۔ کم از کم وہ تو بتا سکتی تھی۔ جتنا بھی شدید صدمہ ہو، رشتے داروں کو بھی تو فون کر کے اطلاع کی جاتی ہے تو کیا وہ اس کے لیے اتنا بھی اہم نہیں کہ ایک چھوٹا سا میسج ہی چھوڑ دیتی۔ وہ جو سوچے بیٹھا تھا کہ اس کے دل میں جگہ بنا چکا ہے تو وہ غلط تھا۔ پھر کیوں وہ اسے حاصل کرنے کا خواب پالے ہوئے ہے۔ وہ فطری طور پر یک طرفہ تعلق داری نبھانے کا قائل نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ سلسبیل کے لیے میسج ٹائپ کیا اور اس کے میسنجر پر سینڈ کر دیا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے، خالی خالی نظروں سے چند پل اسکرین دیکھتا رہا اور پھر آف لائن ہو گیا۔ مگر دل کو مزید بے قراری نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ بے زاری سے اٹھا اور بیڈ پر اوندھا لیٹ کر تکیہ سر کی پشت پر رکھ لیا۔ تکیے کے نیچے اس کی بند آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔

☆☆☆

آج مسلسل تیسرا دن تھا، یسار زبردستی داجی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لے جاتا تھا۔ پہلے دن تو انہوں نے شدید مزاحمت کی مگر یسار نے اپنی کر کے دم لیا۔ رضا بھی اس کار خیر میں اس حد تک شریک ہوتا کہ وہیل چیئر پر بٹھانے میں مدد دیتا۔

خان اللہ یار خان خاصے لحیم شحیم تھے۔ بیماری کے باوجود ان کا دم خم قائم تھا۔ یسار انہیں خاصی دیر باہر کی ہوا کھلانے کے بعد واپس لاتا تھا۔ رضا کی مدد سے انہیں بیڈ پر منتقل کرتا اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرواتا۔ رضا نے بخوشی اسے یہ ذمہ داری سونپی تھی کیونکہ وہ خود تو جتنی دیر انہیں کھلاتا رہتا، ان کے عتاب کا نشانہ بنتا رہتا۔ اس لیے اس نے پورے جوش سے یسار کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"یسار بھائی۔ اس عظیم منصب کو سنبھالنے کے بعد اب ضروری ہو گیا ہے کہ داجی کے جملہ حقوق۔ میرا مطلب ہے دیگر ذمہ داریاں بھی آپ کے حوالے کر دوں۔"

اور یسار جی کھول کر ہنس دیا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی سلسبیل نے ایک کڑوی نگاہ اس پر ڈالی اور بظاہر رضا سے بولی مگر در پردہ وہ یسار کو سنا رہی تھی۔

"تم نادان کے نادان ہی رہنا رضا۔ کچھ لوگ ذمہ داریاں اٹھا تو لیتے ہیں مگر نبھانے کے گر انہیں نہیں آتے۔ جتنی تیزی سے وہ اپنے قدم آگے بڑھاتے ہیں، اس سے زیادہ تیزی سے وہ ہاتھ جھاڑ کر پیٹھ دکھاتے ہیں۔"

رضا بہن کی بات پر خفت سے بغلیں جھانکنے لگا۔ یسار بھی اس کی بات پر متعجب تھا۔ وہ بھلا اسے ایسی باتیں کیوں سنا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

اسلام علیکم!

ہمیں اپنے Blog Kitabdost

http://kitabdostpk.blogspot.be

اور readingpoint

http://readingpointpk.blogspot.be

کے لیے لکھاریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے ناولز
لکھ سکیں جو خواتین و حضرات شوقین ہیں وہ
ہمیں اپنی تحریر (ناول،ناولٹ،افسانہ قسط وار ناول)
اس میل آی ڈی پہ سینڈ کر سکتے ہیں

maisrasultan@gmail.com

فیس بک پہ بھی اس میل کے زریعے رابطہ کریں

دُوسری اور آخری قسط

ام طیفور

تم سے تم تک

امریکہ کے شہر کیلی فورنیا کے ایک قبرستان میں ایک نوجوان کو قبر میں اتارا جاتا ہے یہ ایک دل کو اداس کر دینے والا منظر ہے۔

پاکستان ایرپورٹ پر آنے والا مسافر ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی اسے لینے آیا ہے یا نہیں کیونکہ اس کی آمد کی اطلاع پاکستان میں دے دی گئی تھی۔ رضا اودینی اسے لینے آتے ہیں۔

یسار اور حسان دونوں بھائیوں میں دوستی اور پیار کا رشتہ بھی ہے۔ آرزو اور عباد لودھی میں بہت محبت ہے۔ آرزو عباد لودھی سے اپنی بیٹی کے پاس جانے کی ضد کرتی ہیں جہاں ایک عدد نواسے کا اضافہ ہو چکا ہے۔

یسار اپنی ماں کا گھر دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ گھر میں سب اس کا استقبال اچھے سے کرتے ہیں۔ اس کے نانا خان اللہ یار خان ایک سخت گیر اور دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے یسار کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ اسے اور اس کی ماں کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

آرزو اور عباد کی شادی محبت کی شادی نہیں تھی بلکہ ایک حادثے کا نتیجہ تھی یونی ورسٹی میں ہونے والے ایک حادثے میں غلط فہمی کی وجہ سے خان اللہ یار خان آرزو کی شادی عباد سے کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی لاڈلی بیٹی سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ یسار لودھی انٹرنیٹ پر اپنے ماموں کی بیٹی سلسبیل سے رابطہ میں ہے۔

مکمل ناول

www.pklibrary.com

ایک پل کو تو اس کا دل چاہا کہ سلسبیل کو روک کر پوچھے کہ آخر اس کا پرابلم کیا ہے۔ مگر اس وقت وہ ایسی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے اس الجھن کو سلجھانے کا کام پھر بھی پر ڈال کر وہ داجی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دو دن سے اس نے ان کی فزیکل ایکسرسائز اور تھراپی کی ذمہ داری بھی اٹھالی تھی۔ وہ حسب معمول گرج کے چپ ہو رہے تھے مگر یسار نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے تھے۔ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔ کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی اور اندر داخل ہو کر سب کو مشترکہ سلام کرتا بالکل سیدھ میں چلتا ان کی پائنتی آ کھڑا ہوا۔ بنی بیڈ کے قریب کرسی رکھے داجی کو اخبار سنا رہی تھی۔ زہرہ خاتون بیڈ کے دوسری طرف بیٹھی خان صاحب کے لیے پھل کاٹ رہی تھیں۔ یسار کو دیکھ کر ان کے چہرے پر فرحت آمیز تاثر ابھرا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"خان۔ آپ کا نواسا آیا ہے آپ کو ایکسرسائز کروانے۔"

ان کا انداز جتانے والا تھا۔ پیار کو وہ ان کے سامنے ہمیشہ آپ کا نواسا کہہ کر بلاتی تھیں جیسے رشتہ یاد کرا کے وہ دل پر پڑی بے حسی کی گرد جھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

"بنی۔ چل بھاگ لے بچہ یہاں سے۔ بھیا کو جگہ دے اور ماں سے کہو، تین کپ چائے بھجوا دیں یہاں۔"

انہوں نے بنی کو بھگایا۔ یسار نے ایک گہری نظر خان صاحب کے چہرے پر ڈال کر ان کی ٹانگوں سے نرمی کے ساتھ کمبل ہٹایا۔ خان اللہ یار خان آنکھیں موندے یوں لیٹے تھے جیسے اس کی آمد سے یکسر لاعلم ہوں۔ مگر پلکوں کی جنبش ان کے دل کی ہلچل کا پتا دیتی تھی۔ یسار کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کی مزاحمت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اس نے نرم ہاتھوں سے خان صاحب کی داہنی ٹانگ کو مخصوص انداز میں حرکت دی اور بولا۔

"انیسا بی۔ ماما بتاتی تھیں کہ جب وہ چھوٹی تھیں تو ایک دفعہ چھت پر کھیلتے ہوئے وہ کونے پر بنے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں بند ہو گئی تھیں اور کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں ہیں۔"

اس نے ادھوری یاد دہرا کر خان صاحب کے چہرے کے تاثرات جانچے۔ وہ ویسے ہی تھے سرد اور سپاٹ۔

"ہاں ہاں بالکل بیٹا! اف بڑا سخت وقت تھا۔ ساری کوٹھی چھان ماری تھی لیکن آرزو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ خان تب دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ انہیں اطلاع دے دی گئی۔ قریباً دو ڈھائی گھنٹے بعد خان بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور آتے ہی ایک پل بھی بیٹھے بغیر خود ہی سارا گھر چھاننے لگے۔ مانو اس دن ہمارا گھر اُدھڑ کر رہ گیا۔ گندم سے بھرا بھڑولا سارا صحن میں الٹ دیا تھا انہوں نے۔

پریشان حال خان وہیں صحن میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس دن پہلی بار خان کو روتے دیکھا۔ پھر یک دم انہیں اللہ جانے کیا ہوا، اٹھے اور چھت پر چلے گئے۔ وہاں کونے میں ایک کوٹھری سی بنی ہوئی تھی جو ہمیشہ بند رہا کرتی تھی۔ بہت پرانا اور فالتو کاٹھ کباڑ وہاں بند تھا۔ انہوں نے کمرے کا کنڈا کھول کر اندر جھانکا۔ آرزو ایک سائیڈ پر دھول مٹی میں نیم بے ہوش سی گری پڑی تھی۔

ملازموں کے بچوں کے ساتھ چھت پر کھیل رہی تھی نہ جانے کون شرارت میں کمرے میں بند کر گیا۔ چہرے پر بے تحاشا رونے سے آنسوؤں کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کب سے چلا رہی تھی جو گلا بھی بیٹھ چکا تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں بھلا اوپری کمرے سے اس کی آواز کیسے سنائی دیتی۔ خان وہیں سجدے میں گر گئے اور چھ سال کی آرزو کو گود میں بھر کر نیچے لے آئے۔"

زہرہ خاتون سارے واقعے کو جزئیات سمیت بتاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

"اس کی ہر تکلیف پر یہ ایسے ہی تڑپ اٹھتے تھے۔ میں ماں ہو کر اس کے من کی بات اتنی جلدی نہیں سمجھ پائی تھی جتنی جلدی انہیں پتا چل جاتا تھا۔ اس میں جان تھی ان کی۔"

زہرہ خاتون، خان صاحب کے غصے سے بے نیاز اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں ورنہ یسار کی آمد سے پہلے آرزو کا نام بھی سب بھول چکے تھے۔

یسار نے ناقابل فہم سی نگاہ خان صاحب کے چہرے پر ڈالی اور ہتھیلی کو لوشن سے تر کرنے کے بعد ان کی پنڈلی کا مساج کرتے ہوئے بولا۔

"اونہوں۔ یہ بات میں نہیں مان سکتا انیابی۔ اگر جان بخشی تو اپنی ہی جان کو کوئی ادھ موا کرتا ہے کیا؟ اگر ان کی ہر تکلیف پر یہ تڑپ اٹھتے تھے تو وہ پچھلے ستائیس سالوں سے ماں باپ سے دوری کا کرب سہہ رہی ہیں، تب انہیں محسوس کیوں نہیں ہوا۔"

"نائم! اس سے کہو مجھے تھکن ہو رہی ہے، جائے یہاں سے۔" بالآخر خان صاحب کا صبر جواب دے ہی گیا۔ وہ بولے تو ان کی آواز میں نامحسوس سی بے بسی تھی۔ زہرہ خاتون کچھ بھی نہ بولیں، بس خاموشی سے آنکھیں پونچھ لیں۔ مگر یسار کو جیسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا، وہ مسلسل مشاقی سے مساج کرتے ہوئے بولا۔

"انیابی۔ ماما کہا کرتی تھیں کہ کاش وہ اس دن اس کوٹھری میں مر گئی ہوتیں۔ اگر انہیں پتا ہوتا کہ اپنی باقی زندگی انہیں روز جینا روز مرنا ہے اور کبھی کبھی میں ڈر جاتا ہوں انیابی کہ ان کی ساری زندگی کی مانگی گئی دعا قبول ہونے کی گھڑیاں سر پر ہی نہ منڈلا رہی ہوں۔ وہ اب کے مر ہی نہ جائیں کہیں۔"

یسار نے جیسے جسم سے جان کھینچ لی تھی۔ زہرہ خاتون نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے شدت سے رو دیں۔ یسار نے ہاتھوں کو تولیے کی مدد سے صاف کیا، نظریں مسلسل خان اللہ یار خان پر جمی تھیں۔ وہ ان کے سیلف کنٹرول کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ حرام ہے جو کسی قسم کا تغیر ان کے چہرے پر نمودار ہوا ہو۔ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمبل کو ان کی ٹانگوں پر سلیقے سے برابر کیا اور مڑ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ زہرہ خاتون چہرہ چادر میں چھپائے رو رہی تھیں۔ انہیں اندازہ بھی نہ ہو سکا [illegible] یسار کی آنکھوں سے آنسو بہتے کنپٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

☆☆☆

یسار نے سوئے ہوئے حسان کے سر پر صبح صادق کے وقت ہی دھمال ڈالنا شروع کر دی تھی۔ اس کا ارادہ آج ماما، بابا کے لیے ناشتہ خود تیار کرنے کا تھا اور حسان کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

"اٹھ سانی۔ ابے اٹھ، ورنہ ڈال رہا ہوں تیرے گندے منہ پر پانی۔" وہ گہری نیند سوئے حسان کے کان کے پاس چلایا۔ جواباً اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا چھوٹا سا ڈیکوریشن پیس بند آنکھوں سے ہی یسار کی جانب اچھال دیا جو اس نے کیچ کر کے واپس وہیں دھر دیا۔

"تیرا دماغ خراب ہے کیا۔ ابھی ٹوٹ جاتا تو۔ تجھے پتا ہے تاجری نے گفٹ کیا تھا مجھے۔"

"ہاں۔ تیرے ہزار بار مانگنے پر۔ بھکاری۔"

"ہاں تو کیوں نہ مانگتا۔ کتنے کفس دیے تھے اسے میں نے۔ ایک سوکس کا پیر۔ ایک نیوٹیلا کا جار۔ اس کی گھڑی کے لیے بیٹری۔ ماما کی الیکٹرک کیتل۔ تیرا وہ پین جو تو ہر وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا، وہ بھی اس چڑیل کو دے دیا میں نے۔ وہ ڈائری جو مدت سے بیک کی بیک تیری وارڈروب میں پڑی تھی اور میرے منتیں کرنے پر بھی وہ تو نے مجھے نہیں دی تھی۔ میں نے تاجری کو دے دی۔ اب اور کیا کیا بتاؤں۔"

"تو اب کچھ نہ بتا۔ اب میری باری۔" آنکھیں موندے بڑے ضبط سے سنتا حسان یک دم چھلانگ لگا تا لحاف سے نکلا اور یسار کی گردن دبوچ لی۔ ایک مکا اس کے پیٹ میں مارا جسے ہاتھ کی آڑ سے یسار نے روک لیا۔

"تو۔ زمانے بھر کا فقیر۔ میری اتنی قیمتی چیزیں اس چڑی کی بچی کو دیتا رہا جس نے انہیں آگے آگشن میں بیچ دیا ہو گا۔ اسے تو میری ڈائری گفٹ کر آیا۔ آج تو نہیں بچے گا۔"

وہ اسے مسلسل دبوچے اگلی پچھلی کسر نکال رہا تھا۔ [illegible] یک دم اسے احساس ہوا جیسے یسار کی قسم [illegible]

www.pklibrary.com

حسان کی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے فکرمندی سے یسار کی گردن آزاد کی اور اسے احتیاط سے بیڈ پر لٹا کر آوازیں دیتے ہوئے اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا۔

"لو ئے۔ یار اٹھو۔ اٹھو یار آنکھیں کھول۔" وہ روہانسا ہو چلا تھا۔ "یار آنکھیں کھول۔ کیا ہوا تجھے۔ دیکھ میں مذاق کر رہا تھا۔ تو جو مرضی جی میں آئے، جیری کو دے دے یار! مگر آنکھیں کھول۔ میری طرف دیکھ۔ میری ہر چیز تیری ہے۔ تو جو مانگے گا میں تجھے دوں گا مگر میری طرف دیکھ یار۔"

"تو اپنا گرین چیسٹر اور روبکس کی گھڑی شرافت سے مجھے دے دے۔ چل شاباش۔"

یسار یونہی چت پڑا کسی روبوٹ کی طرح بولا تو حسان کی جان میں جان آئی۔ اور اتنی آئی کہ پھر صحیح معنوں میں وہ اس پر پل پڑا۔ اور اب کے وہ اسے مار نہیں رہا تھا بلکہ اس کے اوپر بیٹھ کر گدگدی کر رہا تھا۔ یہ ایسا ہتھیار تھا جسے حسان ایسے ہی کسی وقت کے لیے تیار رکھتا تھا۔ گدگدی یسار کی کمزوری تھی۔ اسے دور دور سے بھی کوئی گدگدانے کا اشارہ کرتا تو وہ ہنسنے لگتا تھا۔ اور اب تو بچے کے سوا پانچ بجے خاموش ماحول میں یسار کے قہقہے گونج رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر اندھیرے نے روشنی کی پہلی کرن کی انگلی تھام کر اسے کھڑکی کی چوکھٹ پر چھوڑا اور دونوں پر الوداعی نظر ڈال کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دن کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا اور وہ کافی دیر سے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے کبھی اردو فکشن نہیں پڑھا تھا مگر کل اتفاقاً وہ بیسمنٹ میں چلا گیا تھا۔ اتنے دن ہو چکے تھے اسے یہاں آئے ہوئے مگر رضا کی آخر کے باوجود اس نے پورا گھر تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ اسے دیکھنے کے لیے بڑی فرصت اور شوق چاہیے تھا اور یسار عباد کے پاس دونوں کی کمی تھی۔ مگر کل ایک اتفاق اسے اس کوٹھی کی بیسمنٹ کی طرف لے گیا تھا، وہاں کی آرائش اور ترتیب نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ دیگر دو بڑے بڑے کمروں کے ساتھ ملحق ایک وسیع اور کشادہ لائبریری نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دیوار گیر الماریوں کے شیلف سلیقے اور نفاست سے رکھی کتابوں سے سجے تھے۔ وہ ایک پل کو سوچنے لگا کہ اتنا شوقین کون ہو سکتا ہے بھلا۔ اور تبھی اس کی نگاہ اس کی عقبی دیوار پر لگے اسفند یار خان کے پورٹریٹ پر پڑی۔

"تو ہمارے ماموں یہ ذوق رکھتے تھے۔"

وہ اپنی ماں کے ماں جائے کا سرخ و سفید چہرہ دیکھنے لگا جس پر سجے کھڑے نقوش، سرمئی آنکھیں اور عنابی ہونٹوں پر گھنی مونچھیں تھیں۔ یقیناً یہ شخص بے حد ہینڈسم تھا۔ اور جوان بھی۔

اس نے آزردگی سے ایک طویل سانس لیا اور پھر آنکھیں سکوڑ کر پورٹریٹ کے نچلے کنارے پر لکھا پینٹر کا نام پڑھا۔ "شکسبیل" اوہ تو یہ ہنر ان کے ہاتھوں کا ہے۔ وہ بڑبڑاتا پلٹ کر کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ بوریت دور کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ گو کہ پہلے اس نے کبھی بھی اتنی ضخیم کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا مگر وہ خود کو روک بھی نہیں پا رہا تھا۔ ایک ریک میں اسے انگریزی ادب کی بہت سی کتب مل گئی تھیں۔ وہ دونوں زبانوں میں تین چار کتابیں نکال کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ یہ رات پچھلے دو ماہ میں پہلی ایسی رات تھی جب اس نے کمرے کے چکر کاٹ کر صبح نہیں کی تھی۔ دن میں وہ محض واجبی کو لے کر باہر گیا تھا اور پھر واپسی پر ان کے کمرے میں ان کی ایکسرسائز اور تھراپی پر وقت صرف کیا تھا۔ اور اب ساری دوپہر کتاب پڑھنے کے بعد وقت دیکھا تو چونک گیا۔ چار بجنے والے تھے۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھا اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لان پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے ایک کونے میں بنی مصنوعی آبشار کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ نظر پھیرتا، اس آبشار سے کچھ فاصلے پر ایزل اور کینوس لیے کھڑی شکسبیل کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ لائٹ لیمن کلر کے کرتے اور دوپٹے کے ساتھ سفید رنگ کی سگریٹ پینٹ پہنے وہ بڑے انہماک سے برش سے اسٹروکس لگا رہی تھی۔ آف وائٹ سویٹر پر سیاہ سلکی بالوں کا

ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا اور جوڑے میں پینٹ برش پھنسا رکھے تھے۔ یسار کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ایک پل کو کچھ سوچا اور پھر ہاتھ میں تھامی کتاب بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ نیچے لان میں چلا آیا۔ دبے پاؤں چلتا اس کے پیچھے آ کر خاموشی سے کھڑا ہو کر اس کی پینٹنگ کا جائزہ لینے لگا۔ درختوں کے درمیان سے کہیں کہیں سے نکلتی سورج کی کرنیں اور ان کے سامنے وسیع و عریض گھاس کے قطعے پر اٹھکیلیاں کرتے ہرن اور ہرنی۔ دور ایک درخت کی آڑ میں گھات لگائے، تیر سے نشانہ باندھے کھڑا شکاری۔ ہرنی کی سرمستی سے بھری آنکھیں ہرن کو لبھانے کے لیے تھیں جبکہ ہرن چوکنا کھڑا بظاہر ہرنی کی جانب متوجہ تھا مگر جیسے اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ بڑا خوب صورت تھیم تھا۔ رنگوں کا استعمال بڑی مہارت سے کیا گیا تھا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"چوری چھپے کیے جانے والا کوئی بھی کام، کرنے والے کی حیثیت واضح کر دیتا ہے۔ چاہے وہ پینٹنگ دیکھنا ہو یا کسی کی ذاتی لائبریری سے بغیر پوچھے کتابیں اٹھانا۔"

شکسبیل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ یک دم چونک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے اتنا باخبر نہیں سمجھتا تھا۔ وہ چند قدم چلتا ہوا اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ کندھوں پر ہلکی سی گرم شال تھی۔

"میری حیثیت کا اندازہ بس ان ہی دو باتوں سے لگا سکی ہیں آپ؟ حیرت ہے۔ میں آپ کو اتنا کم عقل نہیں سمجھتا تھا۔"

"مت بھولیے آپ اپنے میزبان کو کم عقل کہہ رہے ہیں۔"

"مت بھولیے، کہ ابھی دو منٹ پہلے آپ نے اپنے مہمان کو چور کہا ہے۔"

"چور کو چور ہی کہیں گے نا۔ بھلے سے کسی کو برا لگے۔"

"آپ ہمیشہ مرچیں چبائے رہتی ہیں یا میرے ساتھ کوئی پرانی دشمنی ہے۔"

جواب میں شکسبیل نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بھی نظریں چرا گیا۔ شکسبیل سر جھٹک کر دوبارہ رنگوں سے کھیلنے لگی تھی، اسے مکمل نظر انداز کر کے۔ وہ کچھ پل یوں ہی کھڑا اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جسے سورج کی نرم گرم کرنیں چھو کر یقیناً نازاں ہوتی ہوں گی۔ اس کے گالوں کا گلابی پن نظر کو گرفت میں لیتا تھا۔ بائیں رخسار کی ہڈی کے ابھار پر چھوٹا سا تل تھا۔ ستواں کھڑی ناک میں چھوٹی سی نتھ پہن رکھی تھی جس میں ایک ننھا سا موتی جگمگا رہا تھا۔ گلابی ہونٹوں کے نیچے ٹھوری پر ڈمپل تھا۔ اسے خیال آیا کہ ایسا ہی ڈمپل اس کی ماما کی ٹھوری پر بھی ہے بلکہ اس نے محسوس کیا کہ شکسبیل کی اس کی ماما سے گہری مشابہت ہے۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے ایزل کے قریب آیا اور رسان سے بولا۔

"اگر آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تو فکر نہ کریں۔ جس کام کے لیے آیا ہوں وہ جیسے ہی مکمل ہو جائے گا، میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ ویسے بھی آپ کی شخصیت میں ٹک کر رہنے کی خاصیت موجود نہیں۔ اچھا ہے وہیں لوٹ جائیں جہاں سے آئے ہیں۔ بھلا یہاں آپ کی دلچسپی کا سامان ہی کیا ہے۔"

اپنے اتنے نرم لہجے کے جواب میں اس کے ٹھنڈے ٹھار جواب پر یسار کا دل کیا کہ قریبی اسٹول پر رکھی پانی کی بوتل اٹھائے اور اس پر انڈیل دے۔ بھلا ایسا کیا قصور کیا تھا اس نے جو یہ لڑکی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی۔ وہ ناراض سا واپس جانے کے لیے مڑا مگر یک دم رک گیا، پلٹ کے اس کے قریب آیا، اس کے جوڑے میں اٹکا برش نکالا، اسے پیلٹ میں پڑے سرخ رنگ میں لتھیڑا اور کینوس کے وسط میں برش پھیرتے ہوئے اس کے کان کے قریب دھیرے سے بولا۔

"جس طرح ایک غلط اسٹروک پوری پینٹنگ کی خوب صورتی تباہ کر دیتا ہے بالکل اسی طرح ایک غلط فہمی پوری زندگی کی خوشیاں نگل سکتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ

www.pklibrary.com

ہے۔ آپ کو اب ہو جائے گا۔" وہ آنکھ سے پینٹنگ کی اور اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ برش کو دوبارہ اس کے ریشمی جوڑے میں اٹکایا اور واپس مڑ گیا۔ وہ حق دق سی کھڑی یہ سب دیکھتی رہ گئی۔ اس کی پینٹنگ کے عین وسط میں چڑیا سی سرخ لکیر پوری پینٹنگ غارت کر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ اس نے تنفر سے جاتے ہوئے یسار کی پشت کو دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کے لیے اذیت کا سبب بن جاتا تھا۔ وہ یہ شخص کیوں اس کے لیے اذیت کا سبب بن جاتا تھا۔ وہ تج میں بے خبر تھا یا بے نیاز؟

وہ پیلٹ گھاس پر پھینک کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ پینٹنگ کا دکھ اپنی جگہ مگر ذہن میں مسلسل یسار کا کہا آخری جملہ چکرا رہا تھا۔

☆☆☆

کل سے آرزو بہت بہتر تھیں۔ اتنے دنوں کی یاسیت کے بعد وہ کچھ حد تک اس خول سے نکل آئی تھیں۔ رات کا کھانا عباد صاحب نے باہر سے آرڈر کروایا تھا اور ان سب نے لیٹ نائٹ خوب خوش گپیاں کی تھیں۔ تینوں ہی آرزو کا دھیان بٹانے میں بالآخر کامیاب رہے تھے اور اب یسار، حسان کو منہ اندھیرے زبردستی اٹھا کے کچن میں لایا تھا، بابا اور ماما کے لیے سرپرائز ناشتہ تیار کرنے کے لیے۔ حسان کو یقین تھا کہ اس سارے میں صرف سرپرائز رہ جانا ہے ناشتہ کھیل نہیں ملنا۔ کچن کی حالت الگ لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔

"سانی! انڈے دے۔" یسار نے مصروف انداز میں حسان سے کہا۔

"ابے اوئے۔ بے شرم، بے حیا! میں کیسے دوں، کہاں سے دوں؟" حسان سنک کا نل بند کر کے غرایا۔

"فریج سے دے ذلیل آدمی۔ تیری سوچ ہی گندی ہے۔" پیاز کاٹتے ہوئے وہ بے حد سرسری انداز میں بولے جا رہا تھا۔ حسان فرصت سے دونوں بازو سینے پر باندھ کر کاؤنٹر سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ تو چل شاباش۔ تو دے انڈا۔ چل دے۔" وہ اسے پکار رہا تھا۔ یسار بے حد سنجیدگی سے کام چھوڑ کر مڑا۔ چند قدم اس کی طرف چلتا ہوا آیا مگر بیچ میں ہی ایک جھٹکے سے فریج کی طرف گھوما۔ اسے کھولا اور انڈا نکال کر حسان کی ہتھیلی پر رکھا اور بولا۔

"یہ لے دے دیا انڈا۔ بس اتنی سی فرمائش سانی۔ یہ تو انڈا تھا تو جان مانگتا وہ بھی دے دیتا پگلے۔"

اس کی جاندار ایکٹنگ پر حسان ہنس دیا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سو کیٹنے مرے تو ایک میرا یار پیدا ہوا۔ جس دن تو پیدا ہوا تھا، ہاسپٹل کے باہر سڑک میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ درخت لہرا لہرا کے زمین بوس ہو گئے تھے۔ ان سب نے تجھے سلامی دی تھی ان فیکٹ۔ واہ۔ تو مہا گریٹ ہے یار۔"

حسان بول رہا تھا اور یسار چھاتی پھلاتے ہوئے فخریہ مڑا اور کچن کے سالن والے کیسرول کو مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر تین منٹ پر چلا کر اسی شان سے واپس پلٹا۔ حسان نے بڑی کمینی مسکراہٹ کے ساتھ اسے گھورا اور ایک ہوائی بوسہ بھی دیا۔ یسار گردن اکڑاتے ہوئے واپس چاپنگ بورڈ کی طرف بڑھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد حسان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"ویسے تیری گریٹ نیس کی انتہا ابھی کچھ دیر میں بڑی ماما آ کر بتائیں گی جب انہیں اپنا فیورٹ کیسرول ادھڑی حالت میں ملے گا۔ کیونکہ جسے تو بڑے اسٹائل سے اوون میں رکھ کر آ رہا ہے نا وہ اس میں رکھ کر گرم نہیں کیا جا سکتا۔ اب دے گا بیٹا تو اور پینسل انڈے۔"

"تیری تو....." یسار چلایا۔ "اوئے میرے پیدائشی دشمن۔ پہلے نہیں بتا سکتا تھا کیا۔" وہ بوکھلا کر تیزی سے اوون کی طرف بھاگا۔ اسے آف کیا اور آنکھیں بند کر کے اسے کھولا۔ اندر سے ہلکا ہلکا دھواں باہر آیا اور شدید بدبو بھی۔ کیسرول کا بیڑا غرق ہو چکا تھا۔ وہ غراتے ہوئے حسان پر جھپٹا۔

"تو نے..... تو نے جان بوجھ کر کروایا ہے یہ سب بتا کر مجھے ماما سے جوتے پڑیں۔ آج میں تجھے روسٹ کر دوں گا سانی۔ تو بچ مجھ سے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی گردنیں دبوچ لی تھیں جب کچن میں آرزو کی اینٹری ہوئی۔ وہ حق دق سارا پھیلاوا اور ان دونوں کو تھم تھاد یکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔ کچن کا کیا حشر کر ڈالا ہے تم دونوں نے۔ اور یہ عجیب سے اسمیل کیسی ہے۔ کیا جلا ہے؟"

ایک ہی سانس میں سارے سوالات پوچھتی وہ ناک سکیڑ سکیڑ کر سونگھتی ہوئی اوون کی طرف بڑھیں۔ یسار اور حسان دونوں اسی پوزیشن میں اسٹیچو بنے آرزو کے ری ایکشن کے لیے خود کو تیار کرنے لگے۔ آرزو نے اپنے فیورٹ کیسرول کا یہ حشر دیکھا تو غصے سے پلٹیں لیکن ان کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے حسان بول پڑا۔

"سوری بڑی ماما! یہ مجھ سے ہو گیا غلطی سے۔ یسار مجھے اسی بات پر جھڑک رہا تھا۔ آنٹی تو یہ آپ کو بہت پسند تھا۔ بس مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ اسے اوون میں نہیں رکھنا۔"

یسار نے فدا ہو جانے والی نظروں سے حسان کو دیکھا جو سارا الزام اپنے سر لے کر چلتا ہوا آرزو کے قریب آیا، انہوں نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی سے بال ہٹائے اور بولیں۔

"اٹس اوکے بیٹا! سوری کرنے کی کیا ضرورت ہے میری جان۔ پھر کیا ہوا۔ خراب ہونے والی چیز تھی سو ہو گئی۔"

"نہیں بڑی ماما۔ مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں۔"

"نہیں میرے بچے! ایسا کچھ نہیں ہے۔ دفع کرو اب۔ میں تمہارے بڑے بابا سے ایسا ایک اور منگوا لوں گی۔"

حسان نے آرزو کے ہاتھ کی پشت کو محبت سے بوسہ دیا اور دوسرے ہاتھ سے منہ کھولے، ہو دیے پھاڑے کھڑے یسار کو الٹا انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب "تائیں تائیں فش" تھا۔

"لو بتاؤ بھلا۔ کتنا کمینہ ہے سانی۔ ماما نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ خواہ مخواہ میں مجھے ڈرا رہا تھا۔ ابھی بتاتا ہوں اس ذلیل کو۔" وہ دل میں بڑبڑاتا ہوا فوراً آگے بڑھا اور آرزو کے گلے میں بازو ڈال کر بڑے لاڈ سے بولا۔

"ماما۔ سوسوری۔ یہ مجھ سے ہوا ہے۔ سانی تو بس مجھے بچانے کے لیے خود کے سر لے رہا تھا۔ ورنہ انفیکٹ یہ کیسرول میں نے ہی رکھا تھا اوون میں۔"

"تم کبھی انسان نہیں بن سکتے یسار۔" آرزو کے یک دم تیور بدلے تھے۔ "تم ہو ہی لاپروا۔ جانتے بھی تھے کہ میں کبھی کیسرول کو مائیکرو میں ہیٹ اپ نہیں کرتی، پھر بھی تم نے اسے رکھ دیا۔ اف تم کبھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔" وہ اسے غصے سے گھورتی ہوئی مائیکرو ویو اوون کی طرف بڑھیں اور افسوسناک نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگیں۔ پیچھے کھڑا یسار بے چارگی سے بولا۔

"کیا ماما! سانی کو تو آپ نے کچھ نہیں تھا کہا تھا۔ اس کا تو "میرا بچہ، میرا چندا" بول کر مزید دماغ خراب کر دیا اور مجھے اتنی باتیں سنا دیں۔"

"ہاں تو تمہیں کون سا میں نے پیٹ ڈالا ہے۔ حسان تو اتنا پیارا بچہ ہے کہ سال میں کوئی ایک آدھ برتن ہی اس کے ہاتھوں ٹوٹتا ہو گا جبکہ آپ جناب کچن میں وارد ہو جائیں تو برتن دہائی دینے لگتے ہیں۔ ہر دو دن بعد تو مگ یا گلاس تمہارے ہاتھوں فوت ہو جاتے ہیں میرے نالائق بیٹے۔ اس لیے اس کیسرول کو خراب کرنے پر کیا میں تمہیں ڈانٹوں بھی نا۔"

وہ ہاتھ میں گلوز پہنے اوون سے کیسرول کو باہر نکالتے ہوئے مصروف لہجے میں بولیں۔ یسار نے خونخوار نظروں سے حسان کو دیکھا جو دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے بنا آواز جھٹکے کھا کھا کر ہنسنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"تجھے تو میں واش روم میں بند کر کے ماروں گا سانی۔ باکس روم میں لاک کر کے کوٹوں گا اور۔"

اس کی دھمکی بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔ آرزو نے اس کے کندھے پر چپت لگاتے ہوئے گھرکا۔

"کیوں مارو گے اس بے چارے کو تم۔ ایک تو

www.pklibrary.com

غلطی کرتے ہو، اوپر سے اکڑتے ہو۔ چلو اب نکلو دونوں یہاں سے۔ جا کر اپنے بابا کو اٹھاؤ۔ تب تک میں کچن کی حالت سدھار کر ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ اور آئندہ تم دونوں مجھے کچن میں دکھائی بھی نہ دو۔ لے کر کام بڑھاوتے ہو میرا۔ چلو بھاگو۔"

آرزو نے ان دونوں کو کچن سے باہر دھکیلا۔ حسان نے لاؤنج کی طرف دوڑ لگا دی۔ یسار اس کے پیچھے بھاگا اور کارنر والے صوفے پر اسے جا لیا۔ گھمسان کا رن پڑ چکا تھا۔ کشنز ایک دوسرے کو مارے جانے لگے تھے۔ کوئی وقت جاتا تھا کہ اس کے اندر سے روئی کے نرم گالوں جیسا فر نکل نکل کر سارا لاؤنج کپاس کا کھیت بنا دیتا اپنے کمرے سے نکلتے عباد لودھی نے یہ منظر دیکھا۔ دونوں کی کشتی دیکھ کر انہوں نے ایک نظر اچک کر کچن کے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر زوردار آواز میں "حملہ" بولتے ان کے درمیان کود پڑے۔ ہر جانب سے کشن چل پڑے اور اس دوران تینوں باپ بیٹوں کے بے ہنگم قہقہے صبح صبح چھت پھاڑ رہے تھے۔

اندر کچن میں کام کرتی آرزو کو سب خبر تھی کہ باہر کیا غدر مچا ہوا تھا مگر انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ پھیلاوے کا گیا تھا، آخر مت ہی جاتا مگر آج بہت دن بعد ان کے گھر میں پہلے جیسا ماحول تھا اور وہ یہ شور کچھ دیر رہنے دینا چاہتی تھیں۔ اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ شور وہ آخری بار سن رہی ہیں تو وقت کی نبض تھام لیتیں۔ لمحوں کی ڈور باندھ لیتیں۔ پل پل کو پرو کر مالا بنا لیتیں۔ مگر یہ حادثے.....

☆☆☆

وہ خان اللہ یار خان کے کمرے سے نکلا تو اسے راہداری کے بالکل سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ جس دن سے وہ آیا تھا، اس نے اس کمرے کو بند ہی پایا تھا۔ رضا اور دینی نے اسے بتایا تھا کہ یہ آرزو پھوپھو کا کمرہ ہے جسے صرف زہرہ خاتون یا فاطمہ مامی ہی صفائی وغیرہ کے لیے کھلواتی تھیں۔ اس کے قدم بے اختیار اس کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ دل کی دھڑکن منتشر ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے کمرے کے اندر جھانکا۔ سامنے ہی فاطمہ مامی ملازمہ کے ساتھ مل کر بیڈ شیٹ بچھا رہی تھیں۔ خوب صورت جالی کی فرل والی ہلکے کاسنی رنگ کی بیڈ شیٹ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ سارا کمرہ یوں نکھرا نکھرا تھا جیسے وہاں ہمیشہ سے کوئی بستا ہو۔ بڑی مدھم اور نسوانی سی خوشبو سارے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہو کر بڑے بے خود انداز میں ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے سنگل بیڈ بچھا تھا جس کے ساتھ چھوٹی سی سائڈ ٹیبل رکھی تھی۔ اس کے اوپر ہلکے کاسنی رنگ کا لیمپ تھا جس کا شیڈ اسی کا ہم رنگ تھا۔ لیمپ کے برابر میں فریم تھا جس میں آرزو کی جوانی کی تصویر جڑی تھی۔ اس تصویر میں آرزو نے صرف حجاب لیا ہوا تھا، نقاب نہیں تھا۔ یہ وہ فوٹو تھی جو انہوں نے شناختی کارڈ کے لیے بنوائی تھی۔ وہی تصویر انلارج کروا کے فریم میں لگی تھی۔

کاسنی رنگ کے جالی دار پردوں کے پس منظر میں وسیع و عریض لان کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ ماحول پر کاسنی رنگ چھایا ہوا تھا اور اسی کی وجہ سے کمرہ بہت روشن اور ہوادار محسوس ہو رہا تھا۔ فرش پر تھوڑا گہرے رنگ کا قالین چھب دکھا رہا تھا۔ سارا کمرہ کسی کے حسن ذوق کی کی مکمل تشریح کر رہا تھا۔

فاطمہ ممانی چادر سلیقے سے بچھانے کے بعد پلٹیں تو اسے کھڑا دیکھ کر مسکراتے ہوئے دائیں طرف اشارہ کیا۔ وہاں زہرہ خاتون ڈریسر کے ساتھ رکھی سیٹی پر پرانا البم لیے بیٹھی تھیں۔ فاطمہ مامی ملازمہ کو ساتھ لیے صاف صفائی کا سامان اٹھوا کر باہر چلی گئیں اور وہ زہرہ خاتون کے پاس آ بیٹھا۔ اسے دیکھ کر وہ یک دم چونکی تھیں ورنہ وہ البم میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ اس کے آنے کو محسوس نہیں کر پائی تھیں۔ یسار نے دیکھا، ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے ذرا سا آگے جھک کر البم پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کس کی تصویریں ہیں انیالی۔ کیا ماما کی؟"

"اس کمرے میں جو بھی ہے سب اسی سے تو وابستہ ہے۔ وہ یہاں سالوں سے نہیں ہے مگر اس کی خوشبو جیسے ہر جگہ موجود ہے۔" زہرہ خاتون البم پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ یسار نے ایک لمبی سانس بھری اور بولا۔

"واہی کو کتنا وقت لگے گا ماننے میں؟ اگر ان کے ماننے سے پہلے کوئی انہونی ہو گئی تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" ان کے خلاف توقع جواب پر اسے حیرت ہوئی۔ "میں نے گزرے سالوں میں اللہ سے یہی ایک دعا کی ہے کہ مجھے مرنے سے پہلے میری بچی سے ملوا دے۔ میری سانس تب تک نہیں نکلے گی جب تک آرزو کو ان آنکھوں سے دیکھ نہ لوں۔ میں نے جوان بیٹا کھویا ہے اور اس پر صبر کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ میرا رب مجھے یہ غم نہیں دے گا۔"

یسار ان کے اس قدر یقین پر محض انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ کیا ہوا اگر انہیں یہ پتا چلے کہ جس بیٹی کے ملنے کی دعائیں مانگتی ہیں، وہ اس وقت سات سمندر پار ہوش و خرد سے بیگانہ زندہ لاش کی طرح پڑی ہے۔ اسے بے اختیار جھرجھری آ گئی۔ اس نے فوراً دھیان بٹانے کو البم کا رخ ذرا سا اپنی طرف کیا اور ہر تصویر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ سارا البم آرزو کے بچپن کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک ایک پل کی شرارت، ہنسی، رونا سب یہاں قید تھا۔ وہ دونوں بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے جب ایک نوزائیدہ بچے کی تصویر دیکھ کر یسار بے ساختہ اس کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔

"ارے تم خود کو نہیں پہچانتے۔ یہ تم ہی تو ہو۔ زینیا کی پیدائش یہاں کی تھی لیکن تم وہاں جا کر پیدا ہوئے تھے۔ اسفند کو معلوم ہوا تو اس نے کسی طرح تمہارے بابا سے رابطہ کر کے تمہاری تصویر منگوائی تھی۔ تب تمہارے بابا نے یہ بھیجی تھی اور پھر جب تم پانچ سال کے ہوئے اور پہلی بار اسکول گئے تب عباد بیٹے نے خود ہی اسفند کو یہ والی تصویر بھیجی۔ یہ دیکھو۔"

وہ البم پلٹتے ہوئے اسے اس کے بچپن کی تصویر دکھانے لگیں۔ رنگین تصویر تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں والا بچہ جس کے پھولے پھولے گالوں پر لالی تھی۔ ٹھوڑی کے پاس نمایاں تل اور ٹھوڑی پر پڑتا ڈمپل۔ ہو بہو آرزو کے جیسا تھا۔ زہرہ خاتون محبت سے تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"تم بالکل میری آرزو جیسے ہو۔ ویسی ہی رنگت۔ نین نقش۔ ویسی ہی۔" بولتے بولتے ان کی آواز مدھم ہوئی اور پھر بالکل چپ ہو گئیں۔ غور سے تصویر کو دیکھتی رہیں اور پھر یسار کو دیکھا جس کے ماتھے پر اس سردی میں بھی پسینے کے قطرے چمک اٹھے تھے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھیں اور اگلے لمحے ان کا ہاتھ میکانکی انداز میں اٹھا اور اس کی آنکھوں کو چھو کر ٹھوڑی کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ یسار گھبرا کے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بنا مڑے وہ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

"اے اٹھ یار۔ آج کل تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دم سستی بھر گئی ہے..... اور بڑے دن ہو گئے تم نے اپنے ماموں کی بیٹی کا ذکر کر کے کان نہیں کھائے میرے۔"

یسار اوندھے منہ تکیے میں سر گھسائے پڑا تھا جب حسان ٹریک سوٹ میں اس کے سر پر سوار ہوا۔ آج دونوں کا آف تھا، اس لیے گھر پر دکھائی دے رہے تھے۔

"ماموں کی بیٹی کا ذکر میں نے ہمیشہ کے لیے لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔" یسار کی آواز میں اداسی تھی۔ حسان نے زبردستی اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا اور وجہ پوچھی تو اس نے عباد لودھی سے ہونے والی گفتگو کی مکمل تفصیل اسے کہہ سنائی۔ ساتھ ہی فیس بک پر سٹیبل کے میسجز کھول کر اپنا کیا ہوا آخری میسج بھی پڑھا دیا۔ حسان کا میٹر گھوم گیا۔ اس نے طیش سے اس کے شانے پر ایک مکا جڑا اور بولا۔

Monthly Shuaa June 2019
www.pklibrary.com

"یار تم ... تم اتنے پاگل ہو؟ مطلب تم نے اسے میسج کر دیا کہ اب تمہارے اور اس کے بیچ کوئی تعلق نہیں بن سکتا ہے کیونکہ تم اگر مجھ سے فیئر ہوتیں تو اپنے بابا کی ڈیتھ کے بارے میں ضرور بتاتیں۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔" وہ اس کے موبائل پر اس کا ٹائپ کیا ہوا میسج پڑھتے ہوئے بول رہا تھا۔ "واہ سوپر۔ کیا کمال کی شش ہے تمہاری یار۔ تم کب سے اتنے جلد باز ہو گئے۔ مانا جذباتی تم ہمیشہ سے تھے مگر کوئی اسٹیپ اتنی تیزی سے اٹھاتے میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ یعنی کہ تم نے قصہ ہی تمام کر دیا۔ بڑے بابا سے ماضی کی کہانیاں سنتے تم اتنے آپے سے باہر ہو گئے اور یہ سوچے بغیر کہ اس وقت پاکستان میں تمہارے ماموں کی فیملی پر کیا گزر رہی ہو گی۔ تمہارے اتنے بیک ماموں محض فورٹی فور کی اسپیڈ میں چل بسے، اتنی بڑی آفت ٹوٹ پڑی ان لوگوں پر اور تم توقع کر رہے ہو کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سب سے پہلے تمہیں اطلاع دیتی۔ چلو مان لیا کہ وہ ایسا کر سکتی تھی مگر اب اس نے نہیں کیا تو تم یہ مان لو نا یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہو گا اس وقت۔ فففف! تیرا کچھ نہیں بننا یار۔"

"اب کیا کروں سانی۔ اس نے میسج پڑھ تو لیا ہے مگر کوئی جواب نہیں دیا۔" یسار پژمردہ لہجے میں سر دونوں ہاتھوں سے جکڑتے ہوئے بولا۔ کاش وہ اس وقت اپنے جذبات پر قابو پا لیتا۔ اسے بے حد پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس دن سے لاکھ کوشش پر بھی کہیں دل نہیں لگ رہا تھا، ہر گھڑی دھیان سلسبیل کی طرف لگا رہتا تھا۔

"اب کرنا کیا ہے۔ مٹی ڈال اور کیا۔ تو نے کیا نمک ڈالنا ہے مزید۔" حسان اسے چڑا رہا تھا۔ یسار کی شکل مزید اتر گئی۔ وہ دوبارہ دھپ سے واپس تکیے میں منہ گھسا کے لیٹ گیا۔ حسان کے دل کو کچھ ہوا۔

"اب اس طرح لیٹ کر سوگ نہ منا۔ واپس سوری کا میسج کر اسے اور اسے کہہ کہ جلد ہی پاکستان آؤں گا جہاز پر بیٹھ کر کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر آیا تو قیامت کو ہی پہنچوں گا۔" حسان کے اس طرح کہنے پر یسار کو ہنسی آ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو نہ ہوتا سانی تو پتا نہیں میرا کیا ہوتا۔ تیرے چلے ہوئے کارتوس جیسے مشورے بھی ٹھیک نشانے پر لگتے ہیں۔"

"آج باسکٹ بال کا میچ ہے سائمن اور رینڈل کی ٹیم کا۔ میں نے رینڈل سے کہا تھا کہ ہم دونوں بھی کھیلیں گے۔ بولا، پورے تین بجے پہنچ جانا باسکٹ بال کورٹ میں۔ اب تم اٹھو تیاری پکڑو، جم کے کھیلیں گے آج۔ سائمن سے ادھار چکانا ہے پچھلی ہار کا۔ یاد ہے، آخری پوائنٹ اس نے بے ایمانی سے جیتا تھا۔"

"یار! وہ ایک نمبر کا خبیث ہے۔ تم دیکھ لینا، آج بھی وہ آخر میں ایسا ہاتھ دکھائے گا کہ سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"دکھائے گا تو منہ کی کھائے گا یار! اس بار نہیں چھوڑیں گے اسے۔ تم تیار ہو کر نیچے آؤ، جب تک میں بڑے بابا کو بھی بتا دوں۔" حسان کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھا۔

"ہمم۔ چلو، آتا ہوں مگر پہلے میں سلسبیل کو ٹیکسٹ کر لوں۔"

یسار کے کہنے پر حسان سر جھٹکتا باہر نکل گیا۔ یسار نے موبائل سے ٹیکسٹ کرنے کے بجائے لیپ ٹاپ آن کیا۔ سلسبیل کا اٹیچ اوپن کیا۔ ایک لمبا چوڑا سا معذرتی میسج ٹائپ کیا اور میٹنگ ایریو پر کلک کر کے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا جیپر وارڈ روب سے نکالا اور سیل فون جیب میں ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کا میسج ٹائپ ضرور ہوا مگر کلک کرنے کے باوجود پہنچ نہیں ہو سکا، وہیں ٹائپنگ بار میں پڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

موسم میں خنکی کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ اتنے دن ہو چکے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور جس مقصد کے لیے وہ یہاں آیا تھا، اسے ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا۔ کبھی کبھار لگتا جیسے خان اللہ یار خان، آرزو کی باتیں کرنا چاہتے ہیں مگر جب یسار ان کا ذکر چھیڑ دیتا تب وہ سنگی مجسمہ بن جاتے۔ عباد لودھی ہر روز اسے کال کرتے تھے اور ان کی باتوں میں ایک ہی سوال آس کا رنگ چرائے اس کے جواب کا منتظر ہوتا تھا لیکن وہ ابھی تک انہیں کوئی مثبت جواب نہیں دے پایا تھا۔

ہنی نے میٹرک کے امتحانات میں بہت اچھے نمبرز لیے تھے۔ سارے گھر میں وہ چھلانگیں لگاتی پھر رہی تھی۔ خان اللہ یار خان نے بہت عرصے بعد کسی بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا ورنہ وہ اسفند یار کی موت کے بعد سے مسکرانا تک بھول چکے تھے۔ بدلاؤ تو یسار ان میں لے ہی آیا تھا۔ وہ جو ایک مخصوص سا کھنچاؤ تھا ان دونوں کے بیچ، اس تناؤ میں واضح فرق محسوس ہوتا تھا۔

زہرہ خاتون نے بھی صبح ناشتے کے وقت اور تھراپی کے لیے انہیں یسار کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں کہتے تھے مگر نظریں بار بار دروازے پر ٹھہر جاتی تھیں اور جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوتا، وہ اپنے چہرے کے تاثرات سرد کر لیتے یوں جیسے اس کی شکل سے بھی بیزار ہوں۔ جبکہ یسار کی یہ حالت تھی کہ وہ جلد از جلد آرزو کے لیے اس گھر کے دروازے کھلے دیکھنا چاہتا تھا۔ جو حالات وہ کیلیفورنیا میں چھوڑ کر آیا تھا، اس حساب سے لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔

ہنی کے پاس ہونے پر وہ خود رضا کے ساتھ جا کر بیکری سے بہت سا سامان لے کر آیا۔ لان میں ملازمہ سے کہہ کر ٹیبل لگوائی۔ فاطمہ ممانی کی مدد سے برتن اور کھانے پینے کی چیزیں سجا کر وہ سب کو بلا لایا۔

خان اللہ یار خان کو بھی جس وقت وہیل چیئر پر بٹھا کر رضا باہر لایا تو وہاں خوب سماں بندھا تھا۔ لان میں آتے ہی ان کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئی تھیں۔ وہ ناراض نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے مگر کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ یسار کو دیکھ کر منہ بھی نہیں پھیرا تھا بس گردن اکڑائے پوتی کو چہکتے دیکھتے رہے۔ فاطمہ مامی نے رضا کو سلسبیل کو بلانے کا کہا مگر وہ خود ہی چلی آئی۔ فیروزی اور سرخ امتزاج کے خوب صورت لباس میں وہ اس قدر دل کش لگ رہی تھی کہ یسار کی نگاہ ایک پل کو جم سی گئی۔ اسے اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا اس کے چہرے کی دلکشی کو فیروزی رنگ نے مہمیز کر رکھا تھا یا سرخ نے۔ اس نے گڑبڑا کے نگاہ کو قابو کیا اور ہنی کی طرف متوجہ ہوا۔ سلسبیل داجی کے پہلو میں ان کی وہیل چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت سی رقم تھی۔ ہنی نے پاس ہونے کی خوشی میں کیک کاٹا اور باری باری سب کا منہ میٹھا کرایا۔ سب سے پہلے وہ داجی کے پاس آئی تھی اور ان کے منہ میں محبت سے کیک کا ٹکڑا ڈال کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ خان صاحب نے فرط محبت سے اس کی پیشانی چومی اور زہرہ خاتون کو اشارہ کیا، جنہوں نے اس کے ہاتھ پر لفافہ رکھا۔ پھر اس نے سلسبیل کو کیک کھلایا، جس نے اپنی کیک پیس میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا اور باری باری ہنی کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک میری طرف سے اور ایک بابا کی طرف سے جو آج ہوتے تو سب سے زیادہ خوش ہوتے کیونکہ وہ تمہیں ہمیشہ چھیڑا کرتے تھے کہ ہنی اگر تم نے میٹرک کلیئر کر لیا تو یہ تمہارا نہیں بلکہ تمہاری خوراک کا کمال ہو گا۔"

وہ نم آلود ہنسی ہنستے ہوئے سب کو اداس کر گئی۔ ماحول یک دم سے بے حد بوجھل اور اداس ہو گیا۔ زہرہ خاتون کو تو بہانا چاہیے تھا اپنی دونوں اولادوں کو یاد کر کے رونے کا اور خان اللہ یار خان آج اس حال میں تھے تو یہ اسفند کی جوان موت کا غم ہی تھا جو ان جیسے تناور درخت کی جڑوں میں بیٹھ کر اسے ساری عمر کے لیے بے ثمر کر گیا تھا۔ فاطمہ مامی کے چہرے پر [illegible] ڈالتے [illegible] تھیں [illegible]

www.pklibrary.com

دل شکنی کے ڈر سے فوراً چہرے پر مسکراہٹ کا لیپ کیا اور سلسبیل سے کہا۔

"سلسبیل بیٹا! آؤ ادھر سب کو پلیٹوں میں ڈال کر سرو کرو۔ چھوٹی بہن کی بڑی خوشی ہے بیٹا۔ تمہارے بابا ہوتے تو وہ اس سے بھی زیادہ شاندار انداز میں سلیبریٹ کرتے۔ آؤ شاباش، یہاں آ کر میری ہیلپ کرواؤ۔" ان کے سادہ سے لہجے میں مبہم سی تحریص تھی کہ ماحول کو مزید سوگوار ہونے سے بچایا جائے۔ سلسبیل مرے مرے قدموں سے چلتی ٹیبل کے قریب چلی آئی۔ یسار کی نگاہ اس کے پیروں پر پڑی۔ سرخ اور کالی پٹی کی گھریلو چپل میں اس کے پاؤں موم سے بنے لگ رہے تھے۔ خوبصورت ہاتھ اور پاؤں شروع سے اس کی توجہ کھینچتے تھے۔ سلسبیل باری باری سب کو سرو کرنے کے بعد جب اس کے قریب آئی تو ماتھے پر ان گنت تیوریاں تھیں۔ یسار کو ناگواری کے شدید احساس نے لپیٹ میں لے لیا اور جس وقت سلسبیل نے اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھمائی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"آئندہ مجھے دیکھ کر تمہارے ماتھے پر شکنیں پڑیں تو یقین مانو یہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا۔" سرجھٹکتی مڑنے لگی جب اس کا طنزیہ لہجہ اسے دوبارہ آگ لگا گیا۔

"مجھے کافی چاہیے۔ وہ بھی تمہارے ہاتھ کی۔ پانچ منٹ میں بنا لاؤ ورنہ میں وہ کر گزروں گا جس کے لیے نہ یہ جگہ مناسب ہے اور نہ وقت۔"

ایک پل میں سلسبیل کے چہرے کی رنگت اڑی تھی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھی۔ الٹے قدموں مڑ کر ماں کے کان میں کچھ کہا اور اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔ یسار کا دل اونچی آواز میں قہقہہ لگائے۔ اس نے تو ایویں ڈرانے کے لیے ایسا کہا تھا اور وہ سچ میں حواس باختہ سی اندر گئی تھی۔ ہنی نے رضا کے چہرے پر کیک مل دیا تھا اس لیے سب کا دھیان ان دونوں کی طرف تھا جہاں اب رضا ہنی کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ہنی دادی کی وہیل چیئر کے گرد چکر لگاتی ان سے مدد طلب کر رہی تھی۔ یسار نے خان اللہ یار خان کے چہرے کی طرف دیکھا جو ہنستے ہوئے اتنا نرم تاثر دے رہا تھا کہ اس کا بس کیا وہ یونہی انہیں دیکھتا رہے۔ صرف زہرہ خاتون تھیں جن کی نم آنکھیں یسار کا طواف کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایسی لاچاری تھی کہ یسار نے ایک نظر کے بعد دوسری ڈالنے سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا دل چھلنی ہے مگر ابھی وہ خود کو ان سے زیادہ بے بس محسوس کرتا تھا۔

اسی اثنا میں اس کے موبائل پر تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے پینٹ کی پاکٹ سے سیل نکالا۔ زینیا لاس اینجلس سے ویڈیو کال کر رہی تھی۔ موقع اچھا تھا، اس نے کال پک کر کے اس سے دو چار باتیں کیں اور چلتا ہوا لمب کے بیچ آ کھڑا ہوا۔

"لو زینیا! انیانی سے بات کرو۔ بلکہ اس وقت یہاں سب ہی اکٹھے ہیں۔ تم کہہ رہی تھیں نا کہ سب کو دیکھنا چاہتی ہو۔ لو ملو سب سے۔" وہاں زینیا اس کی بات پر ہکا بکا بیٹھی تھی اور یہاں وہ موبائل کو ٹیبل پر گلاس کی سپورٹ دیتا سکون سے سب کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر آتا زینیا کا چہرہ سبھی سب ہی اشتیاق سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے یہی کرنے یہاں بیٹھے ہوں۔ زہرہ خاتون سے آنسوؤں کی یورش میں بولنا محال ہو رہا تھا اور خان اللہ۔ یار خان کی نظریں زینیا کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

"آرزو" یہ نام ان کے لبوں سے نیم سرگوشیانہ انداز میں بے ساختہ ادا ہوا اور پیچھے کھڑے یسار نے سماعت کیا۔ زینیا کے چہرے میں آرزو کی شباہت بے تحاشا تھی۔ یسار نے ایک طویل سانس لی۔ انا کی چٹان میں دراڑیں پڑ چکی تھیں، چند ضربیں پڑنے کی دیر تھی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر سامنے کے خوشنما منظر پر نظر ڈالی جہاں ہنی اور رضا اچھل اچھل کر زینیا کو اپنے ورشن کروا کے تعارف کے مراحل پورے کر رہے تھے۔

زہرہ خاتون جھجکتے ہوئے اور کن اکھیوں سے خان صاحب کو دیکھتے ہوئے اشارتاً سبھی کا حال احوال پوچھ رہی تھیں۔ ان کے لہجے سے آس اور حسرت بیک وقت ٹپکتی تھی۔

زینیا نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر سامنے کیا اور دادی کو مخاطب کر کے انہیں ان کا پڑنواسا دکھایا۔ خان اللہ یار خان کی آنکھیں اس ننھے سے کلکاریاں مارتے بچے کو دیکھ کر نم ہو گئیں اور یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے خود پر قابو پانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زینیا سے باتیں کر رہے تھے اور سب حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ جو کام ابھی تک یسار نہیں کر پایا تھا وہ اتنی دور بیٹھی نواسی نے کر دکھایا تھا۔ یا شاید خان صاحب لاشعوری طور پر زینیا میں آرزو کو ڈھونڈ رہے تھے۔ زہرہ خاتون کی آواز میں بھی چہکار تھی۔ فاطمہ مامی نے بھی اپنے مخصوص دھیمے اور متبسم لہجے میں زینیا سے بات کی۔

یسار کو یک دم کافی کی طلب پہلے سے زیادہ شدت سے جاگ اٹھی یا اس کا دل دوبارہ سلسبیل سے ماتھا پھوڑنے کو کر رہا تھا۔ اس نے ان سب کو یونہی وہاں چھوڑا اور بے پاؤں اندر کا رخ کیا۔

☆☆☆

باسکٹ بال کورٹ میں میچ زور و شور سے جاری تھا۔ حسان اور یسار رینڈل کی ٹیم میں تھے۔ یسار منجھا ہوا پلیئر تھا اور سائمن کا پرانا حریف بھی۔ لیکن سائمن کو یسار سے خار تھی۔ اس ان چاہی دشمنی کا آغاز سائمن کی جانب سے ہی ہوا تھا۔ وہ یسار کی باسکٹ بال میں مہارت سے خائف تھا اور اب یہ جذبہ شدید ترین حسد کا روپ دھار چکا تھا۔ پچھلے میچ میں یسار کی ٹیم جیت چکی تھی جب بالکل آخری پوائنٹ پر سائمن نے بے ایمانی سے بال باسکٹ میں پھینک کر پوائنٹ گین کر لیا تھا۔ اس کے بعد شدید ہنگامہ شروع ہو گیا تھا جسے مشکل سے رفع دفع کیا گیا۔ لیکن یسار نے اس دن کے بعد سائمن کے مقابل نہ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر کافی عرصہ حساب کی مصروفیت کی بنا پر وقت نہیں مل سکا مگر سب ہی جانتے تھے کہ یسار کے ہتھیار کند نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی کمال کھیلتا تھا اور لاسٹ ڈسٹینس شاٹ میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

حسان اس کھیل کا شوق ضرور رکھتا تھا مگر وہ یسار جیسا ماہر کھلاڑی نہیں تھا۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی بھی کام ایک دوسرے کے بغیر کر گزریں۔ اس لیے وہ دونوں کورٹ میں تھے اور ہی جان سے کھیل رہے تھے۔ تماشائیوں میں خوب ہاؤ ہو مچی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے تک سائمن کی ٹیم تین پوائنٹس سے آگے تھی مگر اب رینڈل کے ایک اور یسار کے یکے بعد دیگرے دو بہترین شاٹس دونوں ٹیموں کے پوائنٹس برابر کر گئے تھے۔

سائمن کی کینہ توز نظریں یسار کو دیکھ رہی تھیں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ آگے بڑھ کر یسار کی گردن دبوچ لیتا۔ اس بار اسے کورٹ مینجمنٹ کی طرف سے سخت وارننگ ملی تھی، لہٰذا وہ سارا غصہ بال پر نکال رہا تھا اور نتیجتاً مزید ایک بھی پوائنٹ نہ بنا سکا اور یسار نے مزید ایک گول کر کے فتح اپنے نام کر لی تھی۔

زوردار شور اٹھا اور رینڈل کی ٹیم جمگھٹا بنائے یسار کے گرد جمع ہو گئی۔ حسان نے اسے کندھے پر اٹھایا اور گول گول گھومنے لگا۔ تماشائی اپنی جگہوں سے کھڑے ہو کر داد دے رہے تھے۔

سائمن اور اس کے کھلاڑیوں نے کچھ دیر شدید طیش کے عالم میں یہ سب دیکھا پھر یک دم سائمن نارمل۔ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہلی بار اس نے آگے بڑھ کر رینڈل کو مبارک باد بھی دی اور یسار کے پاس بھی آیا۔

یسار کے لیے یہ خاصے اچنبھے کی بات تھی کہ اس بار سائمن نے بغیر کوئی ہنگامہ کیے اپنی ہار کو قبول کیا تھا بلکہ وہ اور اس کی ٹیم باری باری سب مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں سے ہاتھ ملاتی ہوئی کورٹ سے باہر جا رہی تھی۔

www.pklibrary.com

حسان نے یسار کو پکڑا اور رش کو چیرتا ہوا اسے نکال کر باہر لے گیا۔ اب باقی کا وقت ان دونوں کا تھا۔ ایسی ہر کامیابی وہ دونوں اکیلے سلیبریٹ کرنا پسند کرتے تھے۔ شام ابھی پوری طرح ڈھلی نہیں تھی۔ وہ دونوں وہاں سے سیدھا بیچ پر گئے تھے۔ نیلے پانی کی وسعتیں ان دونوں کو بانہوں میں لیے ہلکورے کھا رہی تھیں۔ یسار کا تمتماتا چہرہ اس کی اندرونی خوشی کا غماز تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں سمندر کے نیلے پانیوں کا عکس چرائے زندگی اور شرارت سے بھرپور آج عام دنوں سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ حسان کو اس پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ وہ اس کا دوست، اس کا بھائی، اس کا غم خوار سب ہی کچھ تھا۔ جب وہ خوش ہوتا تھا تو حسان کو ساری کائنات اس کی خوشی میں شریک محسوس ہوتی تھی۔ وہ گھٹنے گھٹنے پانیوں میں چلتا ہوا یسار کے قریب آیا، اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلایا اور پھر اس کے لب دوستی کا قصیدہ کہنے لگے۔

"میری جیت، تیری جیت
تیری ہار، میری ہار
سن لے میرے یار
تیرا غم، میرا غم
تیری جان، میری جان
ایسا اپنا پیار
جان پہ بھی کھیلیں گے، تیرے لیے لے لیں گے
سب سے دشمنی
یہ دوستی، ہم نہیں چھوڑیں گے
توڑیں گے، دم مگر
تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

اور گرد نہاتے، ہنستے بولتے گورے پاس اکٹھے ہونے لگے تو سماں بندھ گیا۔ حسان کی آواز غضب کی تھی۔ وہاں انگریزوں کو اس کی زبان کی شدبد بھلے نہ ہو مگر اس کا انداز، آواز کا اتار چڑھاؤ اور سب سے بڑھ کر یسار کو چاہت سے گھتی اس کی آنکھیں سب کو مفہوم سمجھانے میں کامیاب تھیں۔ وہ سب جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ ہلکی ہلکی تالیاں گیت کا ردھم بنائے ہوئے تھیں۔ حسان کی اتنی محبت پر یسار کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ یک دم اس کے سینے سے آ لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یوں بھینچ لیا جیسے رواں رواں ایک دوسرے کا لمس ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ یسار نے چند پل حسان کی پلکوں میں اپنا عکس تلاشا اور پھر تھکان زدہ لہجے میں بولا۔

"چل کافی پلا۔ آج تھکن اتنی ہے کہ جی کرتا ہے آنکھیں موند لوں۔"

حسان اس کے سینے پر ہلکا سا مکا جڑتے اسے لیے کیفے چلا آیا۔ کافی پیتے اور اسنیکس کھاتے اور ساتھ ڈھیروں باتیں کرتے وہیں شام ڈھل گئی تھی۔ یسار نے آج ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ بچپن کے بے شمار قصے۔ جو خود حسان کو بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھے مگر اسے ازبر تھے۔ زینیا اور اس کے بیٹے کی باتیں، عماد لودھی اور آرزو کی باتیں اور تو اور عماد چاچو کی باتیں۔ پھر سب سے آخر میں سلسبیل کی باتیں۔ اس کا خیال رکھنے کی اور اسے پانے کی خواہش۔ وہ اسے کانچ کی گڑیا سے تشبیہہ دیتا تھا اور اتنا ہی اس کے مزاج کی نازکی کا خیال رکھتا تھا۔ یسار نے اسے بتا دیا تھا کہ بیچ کے لیے نکلنے سے پہلے اس نے سلسبیل کو سوری کا میسج کر دیا تھا، اور اسے یقین ہے کہ اس کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔ حسان اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھتا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے بہترین سامع رہا تھا اور یسار کو تو وہ چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ سننے رہنے کا عادی تھا۔

اور پھر جب رات بھیگنے لگی تو حسان گھڑی میں وقت دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اسے بھی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"یار اٹھ۔ دیکھ دس بجنے والے ہیں۔" ساتھ ہی اس نے پینٹ کی جیب سے موبائل نکال کر چیک کیا۔ "فلائٹ شٹ ایہ تو بند ہے۔ پتا نہیں کب کی

چارجنگ ختم ہو چکی ہے اور بڑے بابا نے نہ جانے کتنی کالز کی ہوں گی۔ آج تو بہت ڈانٹ پڑنے والی ہے یار۔ اپنا سیل چیک کر ذرا۔"

"میں نے تو کب کا سیل خود ہی آف کر دیا ہوا ہے سانی۔ آج میں سچ میں تجھ سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا تھا اور تو فکر نہ کر، ماما بابا ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ پکی بات!"

وہ مخمور لہجے میں کہتا حسان کو چونکا گیا تھا۔ وہ اسے زبردستی اٹھاتا کیفے سے باہر نکلا۔ ان دونوں کو رینڈل نے پک کیا تھا، اس لیے ان کی گاڑی ان کے پاس نہیں تھی۔ حسان نے کیب کور کرنے کے لیے اشارہ دینا چاہا مگر یسار نے ضد کی کہ وہ آج پیدل چل کر گھر جائیں گے۔ حسب معمول حسان اس کی مانتے ہوئے سر جھٹک کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ تمام راستہ یسار بے تکان بولتا آیا تھا۔ اب تو حسان نے عاجز آ کر اس کے آگے ہاتھ بھی جوڑ دیے تھے مگر اس کی زبان بریک لگنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"سانی! دیکھ غصہ نہ کرنا۔ اگر مجھے کبھی بھی کچھ ہو جائے نا تو تو وعدہ کر کہ ماما بابا کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ شادی کے بعد بھی ان کے ساتھ رہے گا۔ بول وعدہ؟" وہ ہاتھ پھیلائے برابر چلتے حسان سے عہد لے رہا تھا۔ حسان نے یک دم غصے سے اسے دیکھا اور بولا

"تو پھر ٹریک سے اُترنے لگا یار۔ میرا میٹر ہیچ سڑک پہ مت گھما ورنہ ایسا ہیچ ماروں گا کہ منہ گھوم جائے گا۔"

حسان نے خفا ہوتے ہوئے چلنے کی رفتار تیز کی تو یسار ایک دم سے اس کے سامنے آ کر الٹے پاؤں چلتے ہوئے بولا۔

"تو بیچ ماریا جان سے مار، مگر آج مجھ سے وعدہ کر۔۔۔ کہ میرے ماما بابا کا خیال رکھے گا اور زینیا کو بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔"

"یار۔" حسان نے اسے یار کے بجائے یسار پکارا۔ اس کی ناراضی کی ملامت کی۔ اس کے باوجود یسار نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے رکھا۔

"وعدہ کر پہلے۔"

"وعدہ۔" حسان نے زچ ہوتے ہوئے جان چھڑانے کے لیے اس کے ہاتھ کو دو انگلیاں سے چھو کر پرے کر لیا۔

"ایک اور وعدہ کر۔" یسار ابھی بھی باز نہیں آیا تھا۔ "اگر مجھے کبھی کچھ ہو گیا تو تو پاکستان جائے گا۔ میرے نانا کی راضی کرے گا اور میری ماما کو ان سے ملوائے گا اور۔۔۔۔ اور سلسبیل کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تو۔۔۔۔ تو اس سے شادی کرے گا۔"

"تو کیوں میرا دماغ خراب کر رہا ہے یار۔" حسان نے بے تحاشا زچ ہوتے ہوئے مسکین صورت بنائے یسار کا کالر جھپٹ لیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کی دھلائی شروع کر دیتا جب چند کوس کے فاصلے پر ان کے کانوں میں نامانوس سا شور پڑا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ حسان کے سامنے الٹا چلتا یسار یک دم سیدھا ہوا اور آواز کا منبع تلاشنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ آواز کسی لڑکی کی ہے سانی اور یہ سامنے والی اسٹریٹ سے آ رہی ہے۔ چل چل کر دیکھتے ہیں۔"

"رک یار۔ ہمیں پہلے کاپ کو کال کر دینی چاہیے، نہ جانے کیا صورت حال ہو۔ اپنا موبائل دے۔" بات حسان کی ٹھیک تھی مگر یسار نے رد کر دی۔

"کاپ کو بلایا تو ہمیں بھی پولیس اسٹیشن لے جائے گی۔ ایسے تو بابا شاید چھوڑ دیں مگر ویسے نہیں چھوڑیں گے اور چل کر دیکھیں تو سہی پہلے کہ پچویشن کیا ہے اگر زیادہ مسئلہ ہوا تو تو کال کر دینا۔" یہ کہتے ساتھ ہی وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس اسٹریٹ کے کنارے تک گیا اور سائڈ پر پڑے کوڑے کے ڈرم کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ حسان بھی بالکل اس کے پیچھے جھکا۔ [illegible] مڑ کر جائزہ لینے لگا۔ یسار بولا

www.pklibrary.com

کاموں کے لیے شہرت رکھتا تھا، اس اسٹریٹ کے اندر بنے ایک ایک کمرے کے غلیظ اپارٹمنٹس میں زیادہ تر ہپی اور جرائم پیشہ افراد رہتے تھے۔

''او مائی گارڈ۔ یہ تو سائمن ہے۔ کسی لڑکی کو زبردستی ساتھ لے کر جا رہا ہے۔'' حسان نے سرگوشی کی۔ اسٹریٹ کے اندر کا منظر ہلکے اندھیرے کے باوجود واضح ہو رہا تھا۔ سائمن اور اس کے دو ساتھی ایک لڑکی کو زبردستی سائیڈ پر بنی سیڑھیوں کی جانب دھکیل رہے تھے۔ مگر یسار سن ہی کب رہا تھا، اس کی نظریں تو بس لڑکی کے عبایا اور حجاب پر ٹکی تھیں۔ وہ کوئی مسلمان تھی اور پردہ دار بھی۔ یہ تو اللہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ ان کے ہاتھ کیسے لگی مگر یسار کی رگوں میں انتقام ہونا شروع ہو گئی تھی۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب اسے اپنی ماں کے ساتھ ماضی میں بیتے حادثے کا علم ہوا تھا۔ اس کی ماں کو بھی بے حجاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور اس وقت بے بسی کی تصویر بنی آخری حد تک اپنا دفاع کرتی وہ لڑکی اس کے خون میں ابال کا سبب بنی تھی۔

اس کی نگاہوں میں زینیا کا حجاب میں لپٹا خوب صورت چہرہ گھوم گیا۔ آرزو کا اس عمر میں بھی مکمل پردے میں چھپا سراپا سرسرانے لگا۔ یہ لڑکی جو بھی تھی اسے بچانا فرض تھا۔ یسار ایک دم جگہ سے اٹھا اور ڈرم کے پیچھے سے نکل کر سائمن کو للکارا۔ حسان بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔ سائمن اور باقی دونوں لڑکے حواس باختہ سے گھومے اور اسی اثنا میں اس لڑکی پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ بجلی کی تیزی سے یسار اور حسان کی اور بھاگی اور ان کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ یسار کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ ''جزاک اللہ'' نکلا تھا۔

سائمن، یسار اور حسان کو پہچان چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تو ہمیشہ سے تھی، اس وقت وہ خباثت سے مسکرا بھی دیا۔ تازہ تازہ ہار کا غم تھا جسے غلط کرنے کے لیے ہی یہاں آئے تھے یہ تینوں۔ یہ لڑکی انہیں ہاسپٹل سے نکلتی دکھائی دی تھی، وہیں سے اس کا پیچھا کرتے وہ مین روڈ تک آئے تھے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ یسار اور حسان غیبی امداد بن کر وہاں پہنچ گئے تھے اور اس لڑکی کو فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ سائمن پہلے ہی بپھرا سانڈ بنا ہوا تھا اب تو مزید ڈکراتا ان دونوں کے سامنے آیا۔ حسان کو نہ جانے کیوں لگ رہا تھا کہ اسے کوپ کو کال کر دینی چاہیے۔ اسے سائمن کے اطوار اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ تینوں بدقماشوں نے لی رکھی تھی حسان نے طریقے سے سائمن سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھو سائمن! ہمارا تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں لیکن تمہیں کم از کم ایسی حرکت کرتے شرم آنی چاہیے۔ میں نے پولیس کال دے دی ہے، بہتر ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ اور گھر جا کر آرام کرو تا کہ تمہارے دماغ کو سکون مل سکے۔'' حسان نے پولیس کا ڈر اوا دینے کی کوشش کی تھی۔

''سائمن اس دن آرام نہیں کرتا جب وہ ہار جائے۔ اس دن وہ اپنی شکست کو بھلانے کے لیے وہی کرتا ہے جو آج اور ابھی کرنے والا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے وہ لڑکی بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔'' سائمن کا اشارہ یسار کی طرف تھا جو ابھی بھی اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یار! مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔ میں ان کا دھیان بھٹکاتا ہوں، تم بھاگو۔ یار۔ سن رہا ہے نا میری بات۔'' حسان نے سائمن کے تیور دیکھتے ہوئے یسار کے کان میں سرگوشی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ حسان زچ ہوتے ہوئے دو قدم آگے آیا اور سجاد سے سائمن کو بولا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے سائمن۔ ہم نے اس لڑکی کو نہیں بھگایا بلکہ ہماری جگہ کوئی بھی یہاں آ جاتا تو اسے فرار کا موقع مل ہی جاتا۔'' اس نے دانستہ ''ہر'' کہا تھا تا کہ سائمن کا دھیان یسار سے ہٹ سکے مگر اس کی ایسا کرنے کی نیت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے کان میں کچھ کہتا ہوا ان کی

طرف بڑھنے لگا۔ حسان نے یسار کو دھکا دیا اور اردو میں بولا۔

''بھاگو یار۔ تمہیں پتا نہیں چل رہا کہ وہ تمہارا دشمن بنا ہوا ہے۔ بھاگو۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا سانی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آج اس کا قصہ بھی نمٹا لیتے ہیں۔'' یسار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ حسان کو اب شدت سے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے پولیس کو بروقت کال کیوں نہیں کی۔

سائمن کے دونوں ساتھیوں نے انہیں اردگرد سے گھیر لیا تھا۔ وہ اور یسار بالکل الرٹ کھڑے تھے۔ مگر اگلے ہی پل جو ہوا، وہ ان کی توقع کے برعکس تھا۔ سائمن نے جیب سے چوڑے پھل والا چاقو نکالا تھا اور اسے لہراتا ہوا یسار کی جانب بھاگا تھا۔ اس کے باقی دونوں ساتھی حسان پر پل پڑے تھے۔ یسار اور حسان دونوں ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر حسان بیک وقت دو سے نبرد آزما تھا۔ ایک پل کی چوک ہوئی، حسان کی گردن پر لات پڑی اور وہ اوندھے منہ سڑک پر جا گرا۔ سائمن کے ساتھیوں نے موقع غنیمت جان کر یسار کو پیچھے سے آ کر بازوؤں سے دبوچا اور سائمن نے ایک غلیظ قہقہہ لگاتے ہوئے فضا میں چاقو بلند کیا اور یسار کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

سب کچھ ساکت ہو گیا۔ پورے ماحول نے جیسے چپ کی بکل مار لی۔

☆☆☆

وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کے جاگا تھا۔ شائد کوئی خواب دیکھا تھا، ڈراؤنا خواب۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سردی کے موسم میں بھی وہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ کافی عرصہ ہو گیا تھا وہ راتوں کو اکثر کسی خواب کے زیر اثر گھبرا کے اٹھ جاتا تھا۔ جس بھیانک حادثے سے دوچار ہونے کے بعد وہ پاکستان آیا تھا، اس حادثے کی یاد خوف بن کر اب بھی اس کا پیچھا کرتی تھی۔ اس کے اندر سے جینے تک کی رمق چھین لیتی تھی۔

یہاں آنے کا مقصد بھلے ہی کچھ اور تھا مگر اس کی آڑ میں وہ اپنی یادداشت سے بیتے منظر بھی کھرچنا چاہتا تھا۔ خان اللہ یار خان کے دل پر کمند ڈل چکی تھی۔ وہ اس چٹانی چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب بھی ہو رہا تھا مگر جوں جوں وہ نرم ہو رہے تھے، اس کا دل ڈر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس سے ہینڈل کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا اس ماحول میں۔ وہ اپنے سینے کو مسلتا ہوا بستر سے نکل کر کمرے کی کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ باہر یخ ہوا چل رہی تھی مگر اسے خوشگواریت کا احساس ہوا۔ چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد اس نے گردن اٹھا کر دھند میں لپٹی فضا کو دیکھا تو کیلیفورنیا کی کئی دھند آلود جنسیں ذہن کے پردے پر نمودار ہوئیں جو دو یاروں کی یاری اور جان لٹانے کی حد تک ایک دوسرے سے محبت کی گواہ تھیں۔

وہ بے فکر قہقہے اور باسکٹ بال کی چھینا جھپٹی۔ کچن میں نت نئے تجربے اور برتنوں کی آزمائش۔ راتوں کو دیر سے گھر آنے پر دوسرے کا خاموشی سے انٹرکام سے لاک کھولنا۔ ایک دوسرے کے حصے کی ڈانٹ کھانا اور پھر گدی پر رکھ کے تھپڑ لگانا۔

''آہ۔'' ایک آنسو بے اختیار اس کی آنکھ سے نکل کر بہتا ہوا ہونٹوں کی درز میں آ رکا۔ وہ مرد تھا، مگر جب سے اس کا یار اس سے بچھڑا تھا وہ روز روتا تھا۔ اس کا دل بے طرح اداس ہو گیا۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر اس نے کیلیفورنیا عباد لودھی کو ویڈیو کال کی تھی۔ اس وقت اسے صرف اور صرف ان ہی کی ضرورت تھی۔ بھری دنیا میں ایک وہی تھے جو اس کا درد بانٹ سکتے تھے۔

☆☆☆

پورچ میں ہنی نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ آج اس کا کالج کا پہلا دن تھا اور رضا سے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ انجن میں کوئی گڑبڑ تھی۔ قریب ہی سہیل بھی سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اسے بھی اپنے

www.pklibrary.com

کالج سے دیر ہو رہی تھی مگر وہ اتنی بے چین نہیں تھی یا شاید اس کے تاثرات ہی سرد ہو چکے تھے۔ جب بار بار کوشش سے بھی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی تو رضا جھنجلا کے اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مارتا باہر نکل آیا۔ اسی پل چوکیدار نے گیٹ کھولا تو یسار ہاتھ میں شاپرز پکڑے اندر آیا۔

سلسبیل کی نگاہ اٹھی اور اسی پر ٹھہر گئی۔ سفید شلوار قمیص کے اوپر نیوی بلو جیکٹ پہنے، آستینیں اوپر چڑھائے وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ سلسبیل ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ یسار نے اس کی محویت بھانپ کر بمشکل مسکراہٹ دبائی اور چلتا ہوا ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ہنی نے فوراً سکون کا سانس لیا اور شکر ادا کرتے ہوئے بولی۔

"بڑے نیک وقت پہ آ گئے آپ یسار لالہ۔ یہ گاڑی کو پتا نہیں رضا لالہ نے کیا کر دیا، میرا کالج میں فرسٹ ڈے ہے اور میں پہلے ہی دن لیٹ ہوں۔"

ہنی رضا کو لالہ کہتی تھی اور اب یسار کو بھی۔ سلسبیل کو اس کا ایسا کہنا بالکل نہیں بھاتا تھا۔ یسار نے اس کی بات سن کر بھنویں اُچکاتے ہوئے رضا سے دریافت کیا۔

"اپنی پرابلم رضا۔ یہاں کیوں کھڑے ہو سب.....؟" اس نے پوچھا تو اکتاہٹ کا مارا رضا روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

"یسار بھائی! گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی اور یہ ہنی کی چیخ چیخ نے سر میں درد کر دیا۔ سلسبیل آپی الگ لیٹ ہو رہی ہیں۔ بلکہ ہم سب ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔ مجھے داجی نے آدھے گھنٹے میں فیکٹری نکلنے کے لیے کہا ہے، میرا وہاں پہنچنا بھی بہت ضروری ہے۔ اب ان لوگوں کو چھوڑتا ہوں پہلے تو خود کبھی بھی ٹائم پر نہیں پہنچ سکوں گا اور اگر ایسا ہوا تو داجی مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ پہلے ہی وہ کاروباری معاملات کو لے کر بے حد پریشان ہیں۔"

اتنی تفصیل میں سوائے آخری بات کے یسار کو قابل توجہ کوئی دوسری بات نہیں لگی تھی مگر اس بارے میں پوچھنے کا ارادہ کسی اور وقت پر ٹال کر وہ ہاتھ میں تھامے شاپر رضا کو تھماتے ہوئے خود بونٹ کھول کر اس پر جھک گیا۔

"ان میں داجی کی دوائیاں ہیں، باہر جا رہا تھا سوچا۔ خود ہی لے آؤں۔ تم انہیں اندر پہنچا دو۔"

بونٹ پر جھکے جھکے ہی اس نے رضا سے کہا تو رضا نے چوکیدار کو اشارے سے بلا کر شاپرز اس کے حوالے کیے اور اندر بھیجنے کو کہا۔ وہ سر ہلاتا چلا گیا۔ مزید دو تین منٹ بعد یسار نے سر اٹھا کر رضا سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کو کہا۔ رضا نے اگنیشن میں چابی گھمائی تو وہ یک دم اسٹارٹ ہو گئی۔ مارے خوشی کے ہنی اچھل پڑی۔ رضا بھی شکر کا کلمہ پڑھتا باہر نکلا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ یسار نے نظر بچا کر داد طلب نظروں سے سلسبیل کو دیکھا تو اس نے نخوت سے زیر لب ہونہہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔ رضا نے التجائیہ یسار سے کہا۔

"یسار بھائی پلیز، آپ ہنی اور آپی کو کالج چھوڑ دیں، میں فیکٹری جاتا ہوں ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ پلیز۔"

سلسبیل کی تنبیہی نظروں سے نظر چراتے ہوئے رضا نے گاڑی کی چابی یسار کے ہاتھ میں تھمائی اور خود گھر کے اندر ضروری کاغذات لینے چلا گیا۔ رضا کے پاس ہیوی بائیک تھی اور وہ زیادہ تر اسی پر آتا جاتا تھا۔ ہنی فوراً اندر بیٹھ گئی مگر سلسبیل ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یسار نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اس نے بھی جواباً چڑ کر نہ بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ (ایک تو اس شخص کو ہر دوسری بات اشاروں میں کہنے کی عادت ہے۔)

"دیکھو۔ میں پاگل تو ہوں نہیں کہ تم جیسی پلی پلائی کو ہیرو بنتے ہوئے گاڑی میں اٹھا کے بٹھا دوں کیونکہ اتنا وزن اٹھانے سے میں خود بیٹھ سکتا ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ تم اگر شرافت سے نہ بیٹھیں تو اس دن ایک پینٹنگ خراب کی تھی اب کے تمہاری ایگزیبیشن میں رکھی جانے والی ساری پینٹنگز کے

کمرے کی چابی اتفاق سے میرے ہاتھ کل ہی لگی ہے اور اتفاق سے مجھے پتا ہے کہ کیرو سین آئل اگر پینٹنگز پر گر جائے تو ان کا بیڑہ غرق بھی ہو جاتا ہے اور اتفاق سے اگر تیل گرا کر ان کو شعلہ دکھایا جائے تو وہ بالکل تمہاری طرح بھڑک بھی اٹھتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر یسار ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلسبیل کو تو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ اس کے نازک وجود کو پلا پلایا کہنے پر اس کا سر پھاڑے یا اس کی پینٹنگز غرق کرنے کی دھمکی پر۔ زچ ہوتے ہوئے وہ پیر پٹختی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھی اور اس شدت سے دروازہ مارا کہ یسار نے ایک پل کو آنکھیں میچ کر اسے دوبارہ دیکھا۔ اسے لگا یہ دروازہ اس کے ہی منہ پر مارا گیا ہے لیکن سلسبیل کا تپا تپا سرخ و سفید چہرہ دیکھ کر وہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں سکا تھا۔

☆☆☆

ہنی کو کالج کے باہر اتار کر وہ سلسبیل کے کالج کے روٹ پر گاڑی ڈال کر گاہے بگاہے اس کے چہرہ دیکھنے لگتا تھا۔ سلسبیل اس کی نظریں اپنے چہرے پر صاف محسوس کرتی زچ ہو رہی تھی مگر رخ پھیر کر اسے دیکھا نہیں تھا۔ یسار نے ہاتھ بڑھا کر ڈیک آن کیا تو ایک چیختا چنگھاڑتا انگریزی گانا گاڑی میں گونجنے لگا۔ یہ رضا کی تھرڈ کلاس چوائس کے عین مطابق تھا۔ بھلے اسے خود بھی یہ گانا سماعت پر سخت ناگوار گزر رہا تھا مگر وہ سلسبیل کے چہرے کے بگڑتے زاویوں سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر والیوم کم کیا، یسار نے پھر تیز کر دیا۔ دوبارہ پھر سہ بارہ یہی کھیل دہرایا گیا تو سلسبیل نے سی ڈی نکالی اور شیشہ کھول کر باہر اچھال دی۔ یسار دل ہی دل میں "سوپر لیڈی" کہہ کر رہ گیا۔ گاڑی میں اب قدرے سکون تھا مگر یسار اتنی سست روی سے چلا رہا تھا کہ سلسبیل دھوے سے کہہ سکتی تھی کہ اس سے جلدی وہ پیدل پہنچ سکتی ہے۔

"اب اگر تمہارا ارادہ خود کو باہر پھینکنے کا ہے تو یہ غلطی مت کرنا۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم یقین کرو کہ میں سچ میں کچھ نہیں کروں گا۔" اس کے چہرے سے اس کا ارادہ بھانپ کر یسار نے اسے اپنے بھی ارادے سے آگاہ کیا تو وہ جی جان سے جل گئی۔

"میں خود کو کیوں پھینکوں گی۔ آپ کو نہ دھکا دے دوں۔ لیکن سوری۔" اپنے ماتھے کو متاسفانہ ذرا سا چھو کر بولی "میں بھول جاتی ہوں کہ آپ کو اپنی زندگی سے لوگوں کو فالتو سامان سمجھ کر پھینک دینے کی عادت ہے۔"

اس کی بات پر یسار کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اسے بہت برا لگا تھا اس کا ایسا کہنا۔ اس نے ایک شکایتی نظر اس پر ڈالی مگر وہ گاڑی سے باہر ٹریفک دیکھنے میں مگن ہو چکی تھی۔ آف وائٹ اسکارف کے ہالے میں اس کا سفید اور گلابی چہرہ موتیے کے تھال میں رکھا گلاب کا پھول دکھتا تھا۔ وہ فسوں خیز حسن کی مالک تھی، یسار نے دل سے اعتراف کیا۔ مگر اس کی بات کے ردعمل میں غصے کا اظہار لازمی سمجھتے ہوئے بولا۔

"آج مجھے بتا ہی دو لڑکی کہ میں آخر ایسا کیا جرم کر بیٹھا ہوں کہ جس دن سے میں یہاں آیا ہوں تم ہر وقت ہتھیار تیز کیے مجھ پر آزمانے کو تیار رہتی ہو۔"

اس نے گاڑی کالج کے گیٹ کے آگے روک دی تھی اور جواب کا منتظر تھا۔

"یہ تو آپ خود سے پوچھیں۔ ضمیر نام کی کوئی شے اندر ہو گی تو فوراً جواب مل جائے گا۔" وہ بے رخی سے کہتی گاڑی سے اترنے لگی تو دوپٹے کو جھٹکا لگنے سے واپس سیٹ پر گری۔

"اپنی حد میں رہیں۔" وہ تلملاتے ہوئے کہتے کہتے چپ ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ یسار نے اس کا پلو کھینچا ہے مگر اس کے دوپٹے کا کونا سیٹ کے ساتھ الجھ گیا تھا جبکہ یسار دائیں کہنی دروازے کے شیشے سے ٹکائے ٹھوڑی سہلا رہا تھا، دوسرا بازو ساتھ والی

www.pklibrary.com

سیٹ پشت پر پھیلا رکھا تھا۔ وہ لطف لیتی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا پھر ابرو سے ہی اسے وہ پٹا چھڑانے کا اشارہ کیا۔ سلسبیل نے غصے میں بے رحمی سے اسے کھینچنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی یسار نے ایک طویل سانس خارج کر کے نرمی سے اس کا دوپٹا چھڑایا اور چھوڑ دیا۔ وہ سرد مہری سے اسے دیکھتی آواز کے ساتھ دروازہ بند کرتی چلی گئی۔ یسار اس کے اوجھل ہونے تک اسے محویت سے تکتا رہا پھر یک دم اسے کوئی خیال آیا اور اپنا موبائل نکال کر اس نے فیس بک کا وہ اکاؤنٹ اوپن کیا جس میں سلسبیل ایڈمن تھی۔ فیسٹجر اوپن کر کے اس نے میسجز دیکھنے شروع کیے تو جیسے اس کا سر گھوم کر رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے لاسٹ میسج کو دیکھ رہا تھا جو اس اکاؤنٹ سے سلسبیل کو بھیجا گیا تھا۔

''مجھے جذبات کے اظہار میں بخل سے کام لینا کبھی اچھا نہیں لگا سلسبیل۔ لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا ہے جیسے یہ تعلق یک طرفہ ہے، اسے نبھانے میں تمہیں نہ کوئی دلچسپی ہے نہ شوق۔ ورنہ مجھے اس قابل تو ضرور سمجھتیں کہ ماموں کی ڈیتھ کی اطلاع دے دیتیں۔ تو آج میں تمہیں اس زبردستی کے احساسات سے عاری بندھن سے آزاد کرتا ہوں۔ خوش رہو۔ تمہارے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ یسار عبادا''

دھت تیرے کی۔ اسے یاد تھا کہ اس کے بعد سلسبیل کو منانے کے لیے معذرتی میسج بھی کیا گیا تھا مگر وہ ظاہر نہیں ہوا تھا مطلب کہ وہ ٹائپنگ بار میں ہی پڑا رہ گیا اور چونکہ کافی ماہ سے یہ اکاؤنٹ بند تھا اس لیے ڈیلیٹ بھی ہو گیا۔ اب وہ بے بسی سے اپنے بکھرے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے خاصا مضطرب لگ رہا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح سلسبیل کی غلط فہمی دور کرنا ہی تھی۔ کیسے؟ یہ سوچ کر ہی اس کے ماتھے پر اتنی خنکی میں بھی پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اس نے بند مٹھی کو ہونٹوں پر دو تین بار زور سے مارا اور کچھ طے کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر کے بیک گیئر پر ڈال دی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو ملازماؤں کی ہلکی پھلکی چہل پہل تھی اور لاؤنج میں زہرہ خاتون اور خان اللہ یار خان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دھیمی چال چلتا ان کے قریب آ رہا تھا جب اس کے کانوں میں زہرہ خاتون کی آواز آئی، وہ وہیں تھم گیا۔

''خان! آپ ایک بار ولی محمد کو گھر بلا کر پوچھتے کیوں نہیں۔ کیوں ہر دوسرے دن فیکٹری چلا جاتا ہے۔ رضا ابھی بچہ ہے خان، وہ اس سے دب جاتا ہے اور ولی محمد ہے کہ دیدہ دلیری سے آپ کی فیکٹری میں اپنے احکامات نافذ کیے جا رہا ہے۔ میرا دل گھبراتا رہتا ہے خان۔ مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''پریشان تو میں بھی ہوں خانم۔ مگر میں ولی محمد کو شیر نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اسے پتا چلا کہ میں بے خبر نہیں تو وہ بالکل نڈر ہو جائے گا۔ سوچ رہا ہوں کہ جیسے ہی میری طبیعت میں تھوڑی مزید بہتری آئی ہے تو رضا کو کہوں مجھے لے جایا کرے ساتھ۔ ایک ہی حل ہے ولی محمد کر لگام ڈالنے کا۔'' خان اللہ یار خان کے لہجے میں ڈولتے تفکر نے یسار کی پیشانی پر لکیریں نمایاں کر دی تھیں۔ وہ لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا لہذا سکون سے چلتا ان کے سامنے آیا۔ سلام کر کے زہرہ خاتون کے گال پر پیار کیا اور خان صاحب کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔ نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے دونوں کے چہروں کو بغور دیکھا جو اس کے آتے ہی چپ ہو گئے تھے۔

''کیا بات ہے انیابی۔ کوئی مسئلہ ہے؟ ابھی داجی آپ سے کیا کہہ رہے تھے۔ کون ہیں یہ ولی محمد۔'' اس نے رسان سے زہرہ خاتون سے پوچھا جو نظر چراتے ہوئے خان صاحب کو دیکھنے لگیں جیسے اجازت مانگ رہی ہوں کہ بتائیں یا نہیں بتائیں۔ ان کے بجائے۔ خان اللہ یار خان کڑک دار لہجے میں گویا ہوئے۔

''تمہیں مداخلت کی ضرورت نہیں ہے لڑکے۔ چار دن کے لیے آئے ہو پھر چلے جاؤ گے۔ اپنے سب معاملات ہمیں خود ہی دیکھنے دو۔'' ان کے لہجے میں بچوں جیسا شکوہ جھلک رہا تھا۔ یسار نے مسکراہٹ دباتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے زہرہ خاتون سے پوچھا تو وہ ہمت کر کے بولیں۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں خان آپ۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں یسار بالکل گھر کے فرد کی طرح ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔'' خان صاحب نے بے یقینی سے بیوی کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''ہیں۔ کب.....'' مگر زہرہ خاتون نے ان کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور ہاتھ میں تھامی تسبیح ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

''ولی محمد ان کا بھتیجا ہے یسار۔ اسفند کے جانے کے بعد جب اچانک تمہارے داجی کو فالج ہوا تو اس نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے وقتی طور پر فیکٹری کی ذمہ داری سنبھال لی۔ رضا کھلنڈرا سا لڑکا تھا اسے ابھی تک کاروبار کی سمجھ بوجھ نہیں تھی اس لیے خان نے بھی اعتراض نہ کیا۔ ادھر ہم سب ان کی بیماری میں الجھے رہے اور وہاں ولی محمد نے کاروباری معاملات میں من مانی شروع کر دی۔ پھر ایک دن تنگ آ کر سپروائزر کے ساتھ ایک دو ورکر آئے اور انہوں نے خان کو خبردار کیا کہ اگر جلد ہی کچھ کیا نہ گیا تو ولی محمد فیکٹری پر مکمل قبضہ جما لے گا۔ وہاں بہت کچھ ہے جو وہ بدل چکا ہے لہذا خان نے رضا کو فیکٹری بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سپروائزر اور مینیجر کی مدد سے رضا تھوڑے ہی عرصے میں اس قابل ہو گیا کہ ولی محمد کو فیکٹری کی باگ دوڑ واپس اس کے حوالے کرنی پڑی مگر اس کی نیت میں فتور آ چکا تھا۔ اس نے حیلے بہانے سے رضا کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے آگے وہ بچہ ہی تو تھا، گھبرا گیا مگر خان نے ہمت بندھائے رکھی۔

اب صورتحال یہ ہے کہ ولی محمد ہر دوسرے دن فیکٹری چلا آتا ہے اور رضا کے کاموں میں مداخلت کرتا ہے۔ خان سے اس نے فیکٹری میں سے حصہ بھی مانگا ہے، کہتا ہے چچا کی جائیداد میں حق ہے میرا۔ رضا کی غیر موجودگی میں فیکٹری کا مال اٹھوا کے اپنے گودام میں بھر چکا ہے۔ تمہارے داجی پریشان ہیں کہ اس معاملے سے کیسے نمٹا جائے۔''

زہرہ خاتون خاموش ہوئیں تو یسار نے خان صاحب کو دیکھا جو دونوں کہنیاں ویل چیئر کی ہتھی پر ٹکائے، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی پیشانی پر دباؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ یسار ایک پل کو حیران ہوا کہ اتنی تفصیل سے خالص ذاتی معاملہ شیئر کرنے پر خان اللہ یار خان خاموش کیسے ہیں۔ پس ثابت ہو چکا کہ وہ اس کا وجود تسلیم کر چکے۔ اس کو اپنے گھر کا فرد مان چکے۔ یسار نے دل میں اٹھتی خوشی کو دباتے ہوئے خان صاحب کے دل پہ جیسے ہاتھ رکھ دیا۔

''ہم۔ معاملہ تو پیچیدہ ہے انیابی۔ اصل میں اسفند ماموں فوت ہو چکے اور ان کی نظر میں چونکہ ماما سے لاتعلقی کے بعد ایک وہی تو داجی کی اولاد تھے تو جب وہ نہیں رہے تو ان کا حصہ بنتا ہے اس جائیداد میں۔''

''میری ایک اولاد ابھی زندہ ہے لڑکے امیری بیٹی اسی دنیا میں سانس لے رہی ہے۔ سمجھے۔ اور پھر میرا پوتا اور پوتیاں۔ ان کا کیا؟'' خان اللہ یار خان یک دم بھڑک کر بولے تو زہرہ خاتون نے ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے یسار کو ایسی بات نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ گرم لوہے پر چوٹ مار کر ہٹنا چاہتا تھا۔

''آپ کو کیا خبر کہ وہ اس وقت زندہ بھی ہیں یا۔'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے گیا۔ خان صاحب نے غصے میں زہرہ خاتون کو حکم دیا۔

''اس سے کہیں خانم کہ میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جائے۔ اتنی جرأت آج تک کسی میں نہیں ہوئی جس قدر نڈر ہو کر یہ میرے آگے حجتیں کرتا ہے۔''

www.pklibrary.com

''میں آپ کو صرف احساس دلاتا ہوں کہ ابھی بھی وقت بچا ہے، رکھوئے ہوئے ڈھونڈ لیجیے، روٹھے ہوئے منا لیجیے ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ میرا یقین کیجیے۔''

وہ اٹھ کر خان اللہ یار خان کے گھٹنوں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ خان صاحب نے اس کے چہرے کو جانچا، وہاں التجائیں سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا دل ایک لمحے کو پسیج گیا مگر اس انا کا کیا کرتے جس کے سہارے وہ اتنا زمانہ گزار آئے تھے۔ انہوں نے منہ پھیر لیا۔

یسار ایک افسردہ سانس خارج کرتا کھڑا ہوا اور زہرہ خاتون کو دیکھا جو تاسف سے خان صاحب کو دیکھتی سر جھٹک رہی تھیں۔ یسار نے انہیں مخاطب کیا۔

''انیا بی! کل سے میں رضا کے ساتھ فیکٹری جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں، مجھے ایسے معاملات ہینڈل کرنا آتے ہیں۔ اگر بات زیادہ خراب ہوئی تو ہم لیگل اسٹیپ لیں گے۔ ذرا میں ان کو اپنے دشمن بھی کروا دوں تاکہ انہیں یہ احساس ہو جائے کہ رضا اکیلا نہیں۔!''

خان اللہ یار خان منہ پھیرے خاموش رہے، اسے توقع تھی کہ وہ اسے فیکٹری جانے سے منع کر دیں گے مگر انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ زہرہ خاتون نے فرط جذبات سے اس کا ماتھا چوما اور اس کے سینے پر سر رکھ کر روتے ہوئے سرگوشی کی۔

''یسار۔ میری آرزو کو ملا دو اس کے باپ سے کسی طرح۔ میری بے گناہ بچی کی سزا ختم کروا دو۔''

''آپ دعا کریں بس۔ دعا کریں کہ واقعی ان کی سزا ختم ہو جائے۔ جس تکلیف اور اذیت میں وہ مبتلا ہیں، اس کا خاتمہ ہو جائے۔ بہت کڑی سزا ملی ہے انہیں انیا بی۔ وہ اس کی مستحق نہیں تھیں۔'' گو کہ اس کی آواز بھی کسی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی مگر خان اللہ یار خان کی تیز سماعتوں نے یہ الفاظ سن لیے تھے۔ ان کی آنکھ میں پانی کی لکیر سی ابھری تھی۔

☆☆☆

کچھ یادیں اذیت ناک ہونے کے باوجود سرور دیتی ہیں۔ کیونکہ ان سے جڑے احساسات انسان کے لیے بے حد قیمتی ہوتے ہیں۔

وہ اپنے موبائل پر گیلری کھولے پرانی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ ہر تصویر اس کی آنکھوں میں سرخی سی بھر دیتی تھی مگر پھر بھی وہ بار بار دیکھتا تھا۔ گزرا ہوا ہر پل اذیت ناک ہونے کے باوجود اس کے لیے قیمتی تھا۔ ایک تصویر میں وہ سب ساتھ کھڑے تھے۔ عباد لودھی، آرزو، زینیا، وہ اور۔۔۔

وہ موبائل بیڈ پر رکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے آیا تھا۔ آج کا سارا دن مصروف گزرا تھا۔ وہ رضا کے ساتھ فیکٹری گیا تھا اور وہاں جا کر اسے احساس ہوا کہ بہت سی چیزوں میں گھپلے ہو رہے ہیں۔ رضا کی ناتجربہ کاری فیکٹری کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا رہی تھی اوپر سے ورکرز کی من مانیاں اور ملازم ہوتے ہوئے بھی رضا پر دباؤ ڈالنا۔ یہ سب کس کی شہ پر ہو رہا تھا، سمجھنا مشکل نہیں تھا اور پھر اس کی ملاقات ولی محمد سے بھی ہو ہی گئی۔ وہ رضا کے ساتھ مینوفیکچرنگ ایریا وزٹ کر رہا تھا جب اس نے سفید کڑکڑاتے سوٹ میں کالی واسکٹ پہنے ایک رعب دار سے آدمی کو سامنے سے آتے دیکھا۔ بنا تعارف کے بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شخصیت ولی محمد صاحب کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ ان کے آتے ہی رضا پر ایک عجیب سی بوکھلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ یسار نے آگے بڑھ کر بے حد تپاک سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے ہاتھ ملایا جسے ولی محمد صاحب نے نہایت نخوت سے دو انگلیوں سے چھو کر چھوڑ دیا۔

''خیریت تو ہے۔ کیا چچا کو پوتے کی مردانگی پر شبہ پیدا ہو گیا جو آج اس کے ساتھ نواسے کو بھی کر کے بھیجا ہے۔''

ان کی بات سن کر رضا کے کان خفت کے مارے لال ہو چکے تھے۔ یسار کو بھی ان کا انداز بے حد غیر مناسب لگا مگر برداشت کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''جی نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ دادی کا کہنا تھا کہ مجھے بھی رضا کے ساتھ یہاں آ کر کام سیکھنا چاہیے تاکہ کل کو جب یہ فیکٹری ہم دونوں کے نام ہو تو مجھے اس کی باگ دوڑ سنبھالنی آتی ہو۔''

ولی محمد کے آگ لگ گئی تھی یہ بات سن کر۔ وہ تو کچھ اور پلان کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے رضا سے مخاطب ہوئے۔

''اپنے دادی سے کہنا کہ ان کی عمر اونچی اڑانیں اڑنے کی نہیں رہی اور تمہیں بھی زیادہ اوپر جانے کی ترغیب نہ دیں۔ ان کے پر تو کمزور پڑ چکے ہیں اور تمہارے گننے میں دیر ہی کتنی لگے گی۔''

''سچ کہا آپ نے۔'' یسار نے فوراً بیچ میں کود کر ان کا دھیان اپنی طرف مبذول کیا۔ ''مگر آپ ایک بات بھول گئے۔ نانا جان کے پر کمزور ہو چکے۔ رضا کے کٹ سکتے ہیں مگر میرے پروں کا کیا جن تک رسائی پانا کوؤں کا کام نہیں کیونکہ میں عقاب ہوں۔ میں پلٹ کر جھپٹنا بھی جانتا ہوں اور جھپٹ کر پلٹنا بھی۔ اور ایک وار میں دشمن کو اندھا کرنا بھی مجھے آتا ہے۔''

''اپنی حد پہچانو لڑکے۔'' وہ غرائے اور آواز دبا کر اسے دھمکاتے ہوئے بولے۔ ''جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمہاری ماں تمہاری بھی آواز سننے کے لیے ترس جائے۔'' اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور واپس مڑ گئے۔ بیتے ہوئے کچھ مناظر کی ہولناکی یسار کی آنکھوں کے پردوں پر ابھری مگر وہ ضبط کرتا رضا کے ساتھ آفس کی طرف چل دیا۔ اس شخص سے نمٹنے کے لیے زبان کافی نہیں تھی۔ ضرورت پڑی تو وہ ہر طریقے سے دو دو ہاتھ کرے گا۔

وہ رضا کے ساتھ سارا دن گزار کر گھر واپس آیا تھا جس سے رضا کو بے حد تقویت ملی تھی۔ ورکرز نے بھی یسار کے تیور دیکھتے ہوئے حد میں رہ کر کام کیا تھا۔ گھر واپسی پر اس نے راستے سے دو گجرے لیے تھے، پتا نہیں کیوں مگر ان پھولوں کو دیکھ کر اسے سلسبیل کا ہی خیال آیا تھا۔ ان دونوں کو تھام کر کرتے کی جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی میٹھی مسکراہٹ تھی۔ وہ نظر بچاتا سلسبیل کے کمرے کی طرف آیا مگر وہ اندر نہیں تھی۔ وہ یونہی بے خیالی میں چلتا پچھلی طرف سے چھت کو جاتی سیڑھیوں سے چڑھتا اوپر چلا آیا۔ صاف شفاف آسمان اور کھلی چھت یک دم اس کے مزاج پر اچھا اثر چھوڑ گئی۔ ٹھنڈی یخ ہوا جسم سے ٹکرائی تو اسے بے ساختہ کوئی یاد آ جاتا۔ وہ سر جھٹکتا چند قدم آگے بڑھا تو چھت پر بنے چھوٹے سے کمرے کی دوسری طرف اسے کھلر پٹر کی آوازیں سنائی دیں، وہ چونک گیا اور پھر تجسس سا دبے پاؤں چلتا وہاں تک آیا تو سلسبیل کو ایزل پر پینٹنگ رکھے اپنے دھیان میں گم پایا۔ وہ پوری یکسوئیت سے کینوس پر رنگ بکھیرتی بڑی دلربا لگ رہی تھی۔ اسے بے ساختہ ہنسی آئی۔ بے چاری اس کے ڈر سے اب چھت پر آ کر پینٹنگ بنا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا اور چند ساعت دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

''یوں اوپر آ کر تمہیں لگا کہ تم مجھ سے چھپ گئی ہو؟ میں تو زیر زمین بھی تمہیں اپنے سرہانے ملوں گا۔''

وہ ڈر کر مڑی تو یسار کو دیکھ کر بھنا گئی۔ اس کا بس چلتا تو یسار کو چھت کی سیڑھیوں سے دھکا دے دیتی مگر مٹھیاں بھینچے وہ غصے سے بل کھاتی نیچے جانے لگی تھی کہ یک دم یسار نے اس کا ڈوپٹہ تھام کر اسے روکا۔ وہ بے یقینی اور حیرت میں گھری رک تو گئی مگر مڑی نہیں۔ اسے یسار کی جرات نے گنگ کر دیا تھا۔

''مجھ سے ناراضی ختم کر دو اب سلسبیل۔ میں پہلے ہی بہت سا وقت تمہیں دے چکا ہوں۔ اس کے

www.pklibrary.com

سے اپنی غلطی کا بوجھ اٹھا لوں۔ باقی سب کو میں دھو لوں گا۔"

اس کے لہجے کی آزردگی نے سلسبیل کے دل کو تکلیف دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونا شروع ہوا۔ اس نے چند لمبے لمبے سانس کھینچے اور تھکی۔ اس کا چہرہ ابھی بھی یسار کے ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ اس نے نرمی سے اپنا چہرہ چھڑا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جس دن بابا کی ڈیتھ ہوئی، میں نے ماما کو آپ کے بارے میں سب بتا دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ آرزو پھپھو ہمارے گھر کا ایسا فرد تھیں جو کہیں نہیں تھیں پھر بھی ہر جگہ تھیں۔ میری ماما اور پھپھو فرسٹ کزنز بھی تھیں اور بیسٹ فرینڈز بھی، اس لیے ماما بے حد خوش تھیں اور انہوں نے یہ بات انیالی کو بھی بتا دی۔ سب جیسے دوبارہ سے جی اٹھے۔ انیالی کا بس نہ چلتا تھا کہ کس طرح یہ سب جلدی جلدی ہو جائے۔ مگر اس دن کی شام بڑی اندوہناک تھی۔ بابا شام میں دادی کے ساتھ رونین میں فیکٹری سے گھر آئے تھے۔ ماما نے انہیں کال کر دی تھی کہ شام میں آپ آئیں گے تو آپ کو سرپرائز دوں گی مگر بابا نے ہمیں سرپرائز کر دیا۔ شام کی چائے سب دادی کے کمرے میں پیتے تھے۔ ماما چائے لے آئیں مگر بابا ابھی تک اپنے کمرے سے نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے مجھے بلانے کو بھیجا۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر آڑے ترچھے لیٹے تھے اور دایاں ہاتھ دل کے مقام پر رکھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ میری چیخوں نے سارا گھر ہلا کر رکھ دیا۔ اسی وقت دادی اور رضا غازم کی مدد سے بابا کو گاڑی میں ڈال کر ہاسپٹل لے گئے۔ مگر سب بے سود۔

واپسی پر بابا کی ڈیڈ باڈی آئی تھی۔ دادی کو اس صدمے سے ہاسپٹل میں ہی دل کا دورہ پڑا اور انہیں ایڈمٹ کرنا پڑا۔ بعد ازاں ان کا نچلا دھڑ فالج کی وجہ سے مفلوج ہو گیا۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں ادھ موا کر دیا۔ ہمارے گھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرے پیارے بابا جن کو میری بیٹی کی لڑکیاں میرا بڑا بھائی کہتی تھیں، یوں اچانک ہمیں چھوڑ گئے کہ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دلاسا دینے کے لیے لفظ ہی ختم ہو گئے تو پھر آپ نے کیوں یہ شکوہ پال لیا کہ میں کیسے بھی ہوتا آپ کو اطلاع کرتی۔ یہاں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے سب اور آپ کو مجھ سے یہ لگ رہا کہ میں آن لائن کیوں نہیں آ سکی اور پھر۔ پھر آپ نے بغیر جانے بوجھے مجھے لمبا چوڑا میسج کر دیا کہ میں آپ کو بھول جاؤں، ہم دونوں میں کوئی رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کا یہ میسج پڑھ کر مجھ پر کیا بیتی ہوگی۔ میں تو آپ کے پیچھے یہیں آئی تھی۔ آپ ہی نے مجھے سرچ کر کے رابطہ کیا تھا۔ دن رات آپ ہی میسج کر کے مجھ سے اپنائیت جتاتے رہے اور جب یہ اپنائیت چاہت میں بدلنے لگی تو آپ نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ کیسا شکوہ مزاج ہے آپ کا۔ اور یہاں آ کر آپ کا رویہ اور انداز اس قدر نارمل ہے کہ جیسے یہ سب آپ کے لیے معمولی ہو۔ دل لگی کرنا اور بھلا دینا۔ اور اب جب کہ میں قدم پیچھے ہٹا چکی تو ایک بار پھر مجھے اسی راہ پر ڈالنے چلے آئے جدھر سے میں بڑی مشکل سے پلٹ پائی تھی۔ کیا کہوں میں آپ کو یسار عباد صاحب! ظالم یا بے نیاز؟" وہ اس سے جواب طلب کر رہی تھی۔ یسار خالی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے سن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی۔ وہ سلسبیل کا بازو کہنی سے تھام کر چلتا ہوا نزدیکی بینچ پر آ بیٹھا جو چھت پر بالخصوص بیٹھنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ سلسبیل حیرت سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ اسے ایسا کیا کہنے جا رہا تھا جس کے لیے اس قدر سوچنا پڑ رہا تھا۔ اور پھر یسار نے بولنا شروع کیا۔ ہر منظر ساکت ہو گیا۔ ہوا سانس روکے اس کی چاہنے لگی۔ پرندوں نے دم سادھ لیا اور ڈوبتا سورج آسمان کی چادر تھامے جھولنے لگا جیسے ڈوبنے سے پہلے اسے سننا چاہتا ہو۔ یسار بولتا

جا رہا تھا اور سلسبیل کی سفید رنگت میں زردی گھلتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر ٹھہرے ہوئے لگ رہے تھے کہ اس پر موی کیسے کا گمان ہو رہا تھا۔ نا پلک جھپکے۔ یک ٹک فرش کو دیکھتی وہ یسار کو گہرا ہٹ میں مبتلا کر رہی تھی مگر آج وہ رکا نہیں۔ آج بھی اگر نہ کہتا تو جیتے جی اس کا دم گھٹ جاتا۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی آ بیٹھی تھی۔ یسار نے لب بھینچے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے کمرے نکالے اور انہیں بینچ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ تعلق ایسے ہوتے ہیں جنہیں جوڑتا کوئی ہے اور نباہتے ہم ہیں۔ اور اس نباہنے میں دل، دل سے مل جاتے ہیں۔ دلوں کا ملنا چاہتوں کے سلسلے استوار کرتا ہے۔ جذبوں کو گرمی عطا کرتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ اپنے جذبے بانٹنا چاہتا ہوں۔ اپنی چاہت کا سلسلہ تم سے جوڑنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہوا تو میری خوش قسمتی اور اگر نہ میں ہوا تو میں جس کام کے لیے آیا تھا وہ کر کے ہمیشہ کے لیے وہیں چلا جاؤں گا جہاں سے ٹوٹی کڑیاں لے کر آیا تھا۔ ان کے جوڑنے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے سلسبیل۔ اگر میرا ساتھ دو گی تو میری انگلیاں فگار ہونے سے بچ جائیں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ ساکت بیٹھی سلسبیل پر ایک گہری نگاہ ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ کمرے اس کے پہلو میں رکھنا نہیں بھولا تھا۔ سلسبیل نے میکانکی انداز میں گردن اٹھا کر آسمان کی اور دیکھا۔ ایک تارا ٹوٹ کر ٹھنڈے آسمان میں گم ہوا تھا اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر اس کی گود میں آ گرا تھا۔ اس نے کمروں کو دیکھے بنا اپنا ہاتھ مضبوطی سے ان پر جما دیا اور آنکھیں میچ لی تھیں۔

☆☆☆

خان اللہ یار خان کمرے میں چپ چاپ لیٹے تھے۔ زہرہ خاتون نے ایک دو بار انہیں کہا بھی کہ اٹھ کر باہر چلیں، ذرا ہوا خوری کریں مگر وہ بنا جواب دیے یونہی پڑے رہے۔ اتنا کرو بھی چپ ہو رہیں۔ آج کل فراغت کا سارا وقت وہ بالائی کرتے گزارتی تھیں۔ یسار نے بڑے شوق سے انہیں اپنے لیے نیوی بلو کلر کا سویٹر بنتے کو کہا تھا۔ ان کے ہاتھ مشاقی سے سلائیاں چلا رہے تھے کہ ایک سرسری نگاہ شوہر پر پڑی تو ٹھٹک رہ گئیں۔

خان نے موبائل پکڑ رکھا تھا اور واٹس ایپ پر زینیا کی ڈی پی کھلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آرزو کا چہرہ نظروں میں آ سمایا ہو۔ وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے اور زہرہ خاتون نے حیرت سے دیکھا کہ خان اللہ یار خان کا دل پگھل گیا اور پانی آنکھوں کے سب بند توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ ناقابل یقین تھا یہ سب۔ زہرہ۔ خاتون کو پتا بھی نہ چلا اور ان کے اپنے گال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی شوہر کو پکارا۔

"خان۔ لو اسا سات سمندر پار سے صرف آپ کو منانے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے آرزو آپ کی یاد میں بیمار پڑ چکی ہے۔ خان اب تو معاف کر دیں اسے۔ اب تو میری بھی سزا ختم کر دیں۔"

"خانم۔ تمہیں پتا ہے کہ میں آرزو کو کبھی بھی ذہن سے محو نہیں کر سکا۔ یہ میرے جسم کا ایسا ٹکڑا تھی جسے میں نے بے جان سمجھ کر خود سے اتار بھی پھینکا تب بھی اس کے ساتھ میرے باقی جسم کا ربط نہیں ٹوٹا۔ نہ یہ ربط ٹوٹا اور نہ میری انا۔ ورنہ چھلنی جگر لیے عمر نہ گزار دیتا۔"

"خان۔ میری ممتا پر ایک بار بھی ترس نہ آیا آپ کو۔ آپ مرد تھے جس وقت چاہتے فیصلے کی تلوار ہٹا دیتے، کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ بے بس تو میں تھی نا۔ میں تو آپ کا ہر حکم ماننے کی پابند تھی۔ ستائیس سال گزار دیے خان میں نے۔ نہ بیٹی کو دیکھا نہ ہی اس کی آواز سنی۔ میری تو عمر اولاد کی جدائی کا روگ سہتے سہتے ہی گزر گئی۔" وہ چادر کا پلو ہونٹوں پر رکھے سسک اٹھیں۔ شوہر کی ایک ضد اور انا میں کیے گئے فیصلے نے کتنی زندگیوں کو رول دیا تھا۔

"اس تو تمہاری بیٹی بھی تو کتنی پتھر دل نکلی۔

www.pklibrary.com

سے اپنی غلطی کا بوجھ اٹھا لوں۔ باقی سب کو میں دھو لوں گا۔"

اس کے لہجے کی آزردگی نے سلسبیل کے دل کو تکلیف دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونا شروع ہوا۔ اس نے چند لمبے لمبے سانس کھینچے اور تھکی۔ اس کا چہرہ ابھی بھی یسار کے ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ اس نے نرمی سے اپنا چہرہ چھڑا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جس دن بابا کی ڈیتھ ہوئی، میں نے ماما کو آپ کے بارے میں سب بتا دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ آرزو پھپھو ہمارے گھر کا ایسا فرد تھیں جو کہیں نہیں تھیں پھر بھی ہر جگہ تھیں۔ میری ماما اور پھپھو فرسٹ کزنز بھی تھیں اور بیسٹ فرینڈز بھی، اس لیے ماما بے حد خوش تھیں اور انہوں نے یہ بات انیالی کو بھی بتا دی۔ سب جیسے دوبارہ سے جی اٹھے۔ انیالی کا بس نہ چلتا تھا کہ کس طرح یہ سب جلدی جلدی ہو جائے۔ مگر اس دن کی شام بڑی اندوہناک تھی۔ بابا شام میں دادی کے ساتھ رونین میں فیکٹری سے گھر آئے تھے۔ ماما نے انہیں کال کر دی تھی کہ شام میں آپ آئیں گے تو آپ کو سرپرائز دوں گی مگر بابا نے ہمیں سرپرائز کر دیا۔ شام کی چائے سب دادی کے کمرے میں پیتے تھے۔ ماما چائے لے آئیں مگر بابا ابھی تک اپنے کمرے سے نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے مجھے بلانے کو بھیجا۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر آڑے ترچھے لیٹے تھے اور دایاں ہاتھ دل کے مقام پر رکھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ میری چیخوں نے سارا گھر ہلا کر رکھ دیا۔ اسی وقت دادی اور رضا غازم کی مدد سے بابا کو گاڑی میں ڈال کر ہاسپٹل لے گئے۔ مگر سب بے سود۔

واپسی پر بابا کی ڈیڈ باڈی آئی تھی۔ دادی کو اس صدمے سے ہاسپٹل میں ہی دل کا دورہ پڑا اور انہیں ایڈمٹ کرنا پڑا۔ بعد ازاں ان کا نچلا دھڑ فالج کی وجہ سے مفلوج ہو گیا۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں ادھ موا کر دیا۔ ہمارے گھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرے پیارے بابا جن کو میری بیٹی کی لڑکیاں میرا بڑا بھائی کہتی تھیں، یوں اچانک ہمیں چھوڑ گئے کہ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دلاسا دینے کے لیے لفظ ہی ختم ہو گئے تو پھر آپ نے کیوں یہ شکوہ پال لیا کہ میں کیسے بھی ہوتا آپ کو اطلاع کرتی۔ یہاں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے سب اور آپ کو مجھ سے یہ لگ رہا کہ میں آن لائن کیوں نہیں آ سکی اور پھر۔ پھر آپ نے بغیر جانے بوجھے مجھے لمبا چوڑا میسج کر دیا کہ میں آپ کو بھول جاؤں، ہم دونوں میں کوئی رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کا یہ میسج پڑھ کر مجھ پر کیا بیتی ہوگی۔ میں تو آپ کے پیچھے یہیں آئی تھی۔ آپ ہی نے مجھے سرچ کر کے رابطہ کیا تھا۔ دن رات آپ ہی میسج کر کے مجھ سے اپنائیت جتاتے رہے اور جب یہ اپنائیت چاہت میں بدلنے لگی تو آپ نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ کیسا شکوہ مزاج ہے آپ کا۔ اور یہاں آ کر آپ کا رویہ اور انداز اس قدر نارمل ہے کہ جیسے یہ سب آپ کے لیے معمولی ہو۔ دل لگی کرنا اور بھلا دینا۔ اور اب جب کہ میں قدم پیچھے ہٹا چکی تو ایک بار پھر مجھے اسی راہ پر ڈالنے چلے آئے جدھر سے میں بڑی مشکل سے پلٹ پائی تھی۔ کیا کہوں میں آپ کو یسار عباد صاحب! ظالم یا بے نیاز؟" وہ اس سے جواب طلب کر رہی تھی۔ یسار خالی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے سن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی۔ وہ سلسبیل کا بازو کہنی سے تھام کر چلتا ہوا نزدیکی بینچ پر آ بیٹھا جو چھت پر بالخصوص بیٹھنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ سلسبیل حیرت سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ اسے ایسا کیا کہنے جا رہا تھا جس کے لیے اس قدر سوچنا پڑ رہا تھا۔ اور پھر یسار نے بولنا شروع کیا۔ ہر منظر ساکت ہو گیا۔ ہوا سانس روکے اس کی چاہنے لگی۔ پرندوں نے دم سادھ لیا اور ڈوبتا سورج آسمان کی چادر تھامے جھولنے لگا جیسے ڈوبنے سے پہلے اسے سننا چاہتا ہو۔ یسار بولتا

جا رہا تھا اور سلسبیل کی سفید رنگت میں زردی گھلتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر ٹھہرے ہوئے لگ رہے تھے کہ اس پر موی کیسے کا گمان ہو رہا تھا۔ نا پلک جھپکے۔ یک ٹک فرش کو دیکھتی وہ یسار کو گہرا ہٹ میں مبتلا کر رہی تھی مگر آج وہ رکا نہیں۔ آج بھی اگر نہ کہتا تو جیتے جی اس کا دم گھٹ جاتا۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی آ بیٹھی تھی۔ یسار نے لب بھینچے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے کمرے نکالے اور انہیں بینچ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ تعلق ایسے ہوتے ہیں جنہیں جوڑتا کوئی ہے اور نباہتے ہم ہیں۔ اور اس نباہنے میں دل، دل سے مل جاتے ہیں۔ دلوں کا ملنا چاہتوں کے سلسلے استوار کرتا ہے۔ جذبوں کو گرمی عطا کرتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ اپنے جذبے بانٹنا چاہتا ہوں۔ اپنی چاہت کا سلسلہ تم سے جوڑنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہوا تو میری خوش قسمتی اور اگر نہ میں ہوا تو میں جس کام کے لیے آیا تھا وہ کر کے ہمیشہ کے لیے وہیں چلا جاؤں گا جہاں سے ٹوٹی کڑیاں لے کر آیا تھا۔ ان کے جوڑنے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے سلسبیل۔ اگر میرا ساتھ دو گی تو میری انگلیاں فگار ہونے سے بچ جائیں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ ساکت بیٹھی سلسبیل پر ایک گہری نگاہ ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ کمرے اس کے پہلو میں رکھنا نہیں بھولا تھا۔ سلسبیل نے میکانکی انداز میں گردن اٹھا کر آسمان کی اور دیکھا۔ ایک تارا ٹوٹ کر ٹھنڈے آسمان میں گم ہوا تھا اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر اس کی گود میں آ گرا تھا۔ اس نے کمروں کو دیکھے بنا اپنا ہاتھ مضبوطی سے ان پر جما دیا اور آنکھیں میچ لی تھیں۔

☆☆☆

خان اللہ یار خان کمرے میں چپ چاپ لیٹے تھے۔ زہرہ خاتون نے ایک دو بار انہیں کہا بھی کہ اٹھ کر باہر چلیں، ذرا ہوا خوری کریں مگر وہ بنا جواب دیے یونہی پڑے رہے۔ اتنا کرو بھی چپ ہو رہیں۔ آج کل فراغت کا سارا وقت وہ بالائی کرتے گزارتی تھیں۔ یسار نے بڑے شوق سے انہیں اپنے لیے نیوی بلو کلر کا سویٹر بنتے کو کہا تھا۔ ان کے ہاتھ مشاقی سے سلائیاں چلا رہے تھے کہ ایک سرسری نگاہ شوہر پر پڑی تو ٹھٹک رہ گئیں۔

خان نے موبائل پکڑ رکھا تھا اور واٹس ایپ پر زینیا کی ڈی پی کھلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آرزو کا چہرہ نظروں میں آ سمایا ہو۔ وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے اور زہرہ خاتون نے حیرت سے دیکھا کہ خان اللہ یار خان کا دل پگھل گیا اور پانی آنکھوں کے سب بند توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ ناقابل یقین تھا یہ سب۔ زہرہ۔ خاتون کو پتا بھی نہ چلا اور ان کے اپنے گال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی شوہر کو پکارا۔

"خان۔ لو اسا سات سمندر پار سے صرف آپ کو منانے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے آرزو آپ کی یاد میں بیمار پڑ چکی ہے۔ خان اب تو معاف کر دیں اسے۔ اب تو میری بھی سزا ختم کر دیں۔"

"خانم۔ تمہیں پتا ہے کہ میں آرزو کو کبھی بھی ذہن سے محو نہیں کر سکا۔ یہ میرے جسم کا ایسا ٹکڑا تھی جسے میں نے بے جان سمجھ کر خود سے اتار بھی پھینکا تب بھی اس کے ساتھ میرے باقی جسم کا ربط نہیں ٹوٹا۔ نہ یہ ربط ٹوٹا اور نہ میری انا۔ ورنہ چھلنی جگر لیے عمر نہ گزار دیتا۔"

"خان۔ میری ممتا پر ایک بار بھی ترس نہ آیا آپ کو۔ آپ مرد تھے جس وقت چاہتے فیصلے کی تلوار ہٹا دیتے، کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ بے بس تو میں تھی نا۔ میں تو آپ کا ہر حکم ماننے کی پابند تھی۔ ستائیس سال گزار دیے خان میں نے۔ نہ بیٹی کو دیکھا نہ ہی اس کی آواز سنی۔ میری تو عمر اولاد کی جدائی کا روگ سہتے سہتے ہی گزر گئی۔" وہ چادر کا پلو ہونٹوں پر رکھے سسک اٹھیں۔ شوہر کی ایک ضد اور انا میں کیے گئے فیصلے نے کتنی زندگیوں کو رول دیا تھا۔

"اس تو تمہاری بیٹی بھی تو کتنی پتھر دل نکلی۔

www.pklibrary.com

اسلام علیکم!

ہمیں اپنے Blog Kitabdost

http://kitabdostpk.blogspot.be

اور readingpoint

http://readingpointpk.blogspot.be

کے لیے لکھاریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے ناولز
لکھ سکیں جو خواتین و حضرات شوقین ہیں وہ
ہمیں اپنی تحریر (ناول،ناولٹ،افسانہ قسط وار ناول)
اس میل آی ڈی پہ سینڈ کر سکتے ہیں

maisrasultan@gmail.com

فیس بک پہ بھی اس میل کے زریعے رابطہ کریں

میں ناراض تھا تو اس نے کون سا پلٹ کر دیکھ لیا۔ ملک تک چھوڑ گئی۔ کیا میں اتنا برا تھا خانم کہ اگر وہ میری چوکھٹ پر دوبارہ آتی تو میں اپنے گھر کے دروازے نہ کھولتا؟ بتاؤ خانم۔ کیا میں واقعی اتنا برا تھا۔ کیا تم نے ان گزرے سالوں میں کبھی بھی میری آنکھوں میں وہ تڑپ نہیں دیکھی جو باپ کی آنکھوں میں اولاد کے لیے ہوتی ہے۔ میں بھی تو انتظار ہی کرتا رہ گیا خانم کہ ایک بار۔ بس ایک بار میری آرزو آجائے۔ میں اس سے منہ پھیروں، وہ مجھے منائے۔ میں پھر بھی نہ مانوں تو وہ گلے سے لگ جائے۔ لیکن میرے پاس سے کہیں نہ جائے۔ لیکن میرا انتظار، انتظار ہی رہا خانم۔ وہ کبھی آئی ہی نہیں۔ اس کی رگوں میں میرا خون ہے خانم، وہ مجھ جیسی ہی نکلی۔"

اور زہرہ خاتون تھیں کہ گنگ بیٹھی انہیں یوں تک رہی تھیں جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ یہ روپ تو پہلی بار ہی دیکھا تھا انہوں نے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ خان اپنی بیٹی کو یاد کرتے تھے۔ درد کی ایک تیز لہر دل کاٹتی گزر گئی۔ اتنے سال وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔ اور دوریوں میں عمر گزر گئی۔ وہ شکستہ وجود لیے اٹھیں اور ٹوٹے قدموں سے چلتی شوہر کے پیروں کے قریب بیٹھ گئیں۔ ان کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ خان صاحب کا چہرہ بھی ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے دلاسے کے لیے لفظ سوچ کر رہ گئے۔

اگلے ہی پل دروازہ زوردار جھٹکے سے کھلا تھا اور فاطمہ ممانی حواس باختہ سی اندر داخل ہوئیں۔ خان اللہ یار خان اور زہرہ خاتون کو جیسے کسی انہونی کے احساس نے جکڑا تھا۔

"داجی۔ انیہ بی۔ یسار کو گولی لگ گئی۔ ولی محمد نے اس پر فائر کھول دیا۔"

زہرہ خاتون کو غش آگیا۔ خان اللہ یار خان نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو مفلوج ہوتا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے لگے تھے یسار کو ہوش آنے میں۔ اور پورا ایک ہفتہ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہا تھا۔ اس دوران داجی بلاناغہ ہاسپٹل آتے رہے تھے اور شام تک اسی کمرے میں وہیل چیئر پر بیٹھے اس کا چہرہ دیکھتے رہتے تھے۔ یسار کو ہوش آیا تو اس نے ان کی منت تک کر ڈالی کہ وہ گھر پر ہی رہا کریں، یہاں آکر خود کو بے آرام نہ کیا کریں۔ مگر داجی نے۔۔۔ یسار کی پٹی سے لگ کر بیٹھ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی جیسے۔

جب سے انہیں رضا کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ یسار اس کی طرف آتی گولی کے نشانے پر خود سامنے آگیا تھا تب سے داجی کا دل تکلیف اور شرمندگی سے بوجھل ہو گیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو یسار کے خون کے ہر ایک قطرے کا ولی محمد سے حساب لیتے۔ مگر قدرت نے یہ کام خود ہی کر دیا تھا۔ ولی محمد اسی وقت اپنے ہی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن کے مارا گیا تھا۔

اس دن وہ ایک بار پھر پورے رعب داب کے ساتھ فیکٹری چلا آیا تھا۔ رضا کو نفسیاتی دباؤ میں تو وہ کب کا لے چکا تھا اب یسار کو گھیرے میں لینا تھا۔ مگر وہ بھی یسار عباد تھا جو کیلیفورنیا میں ملٹی نیشنل کمپنی کا لیگل ایڈوائزر تھا۔ وہ قانونی داؤ پیچ جانتا تھا اور ایسوں سے نبٹنا بھی اسے خوب آتا تھا۔

ولی محمد نے آتے ہی ورکرز کو کام بند کرنے کا حکم دیا اور رضا کو گھر چلے جانے کا کہا۔ یسار کو اس بات پر تاؤ آگیا، اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کیا تو محض ڈرانے کی خاطر ولی محمد نے گارڈ کو اشارہ کیا جس نے گن سے ہوائی فائر کیا۔ یسار نے آگے بڑھ کر ایک زوردار پنچ گارڈ کے جبڑے پر رسید کیا اور بس یہیں پر ولی محمد کا دماغ الٹ گیا، اس نے گارڈ سے گن چھینی اور بالکل سامنے کھڑے رضا پر فائر کر دیا۔

عین اسی لمحے یسار جست لگا تا رضا کے سامنے تھا۔ گولی اس کی کمر میں کندھے سے ذرا نیچے پیوست ہو گئی۔ لمحوں میں وہ خون میں لت پت ہو گیا۔ رضا

www.pklibrary.com

بوکھلا کر رونے لگا اور ورکرز کو آوازیں دینے لگا۔

فیکٹری کے گارڈز فوراً ولی محمد اور اس کے گارڈ کی طرف لپکے۔ وہ دونوں ہی حواس باختہ ہو چکے تھے اور اسی بوکھلاہٹ میں ولی محمد کے گارڈ نے اپنے بچاؤ کے لیے پھر فائر کھول دیا اور اس بار اس کے نشانے کی زد پر ولی محمد اور دو ورکرز آئے۔ ولی محمد کا وہیں کام تمام ہو گیا جبکہ ورکرز کو زخمی حالت میں فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا۔

یوں سالوں سے خان اللہ یار خان کے جس بھتیجے نے اپنے چچا کے زر کی خاطر ان کے گھر کی زن پر نگاہ رکھی وہ تو اسے نہ مل سکی مگر دولت بھی اس کی قسمت میں نہ تھی۔ وہ ایک گولی دل کے مقام پر کھا کر چت ہو گیا تھا۔

وہ ان کی بیٹی کی اولاد تھا، انہیں رفتہ رفتہ جان سے عزیز ہو گیا، یہ الگ بات کہ اس الفت کا اقرار انہوں نے خود سے بھی نہیں کیا تھا۔ اور آج اسی لمبے اونچے شہزادے سے نواسے کو ہاسپٹل کے بیڈ پر دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ سب ہی گھر والے اس کے ممنون تھے۔ فاطمہ ممانی اس کے زیر بار تھیں کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی جان بچائی تھی اس نے۔ رضا کو وہ پہلے سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا، وہ بھی مسلسل اس کے پاس ہاسپٹل میں تھا۔ ہنی تو باقاعدہ اس کا ہاتھ تھام کر بچوں کی طرح رو پڑتی تھی۔ زہرہ خاتون اس پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھیں۔

ہاں یسار نے اس پورے ایک ہفتے میں سلسبیل کا انتظار کیا تھا مگر وہ ایک بار بھی نہیں آئی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اس کے سرہانے روز تازہ گلابوں کا گلدستہ پڑا ہوتا تھا جو وہ جانتا تھا کہ نہ رضا لاتا ہے، نہ انیہ بی اور نہ داجی۔ تو پھر یہ جو بھی لاتا تھا یا بھجواتا تھا اس کے لیے تو ہر گلاب، آب حیات تھا۔

گھر آنے کے بعد بھی جب اسے ایسا ہی گلدستہ سرہانے ملتا رہا تو ایک رات اس نے بھی جاگتے رہنے کی قسم کھا لی۔ وہ ساری رات بستر پر چت لیٹا محو انتظار رہا۔ اور پھر پو پھٹنے کے ذرا بعد اس کے کمرے کا دروازہ غیر محسوس انداز میں کھلا تھا۔ اس نے نیند کے خمار میں ڈوبی آنکھوں کو میچ لیا۔ آنے والا دبے پاؤں چلتا اس کے بیڈ کے پاس آ کر رکا۔ چند پل یسار کے چہرے کو تکتے رہنے کے بعد اس نے پھولوں کا ہاتھ سے بنا گلدستہ اس کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ آنے والا واپس پلٹتا، یسار نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر کلائی تھام لی۔ سلسبیل کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ سراسیمہ سی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کلائی چھڑانے لگی تو وہ یونہی لاپروائی سے بولا۔

"اچھا لگا یہ جان کر کہ تمہیں میری پرواہ ہے۔ ورنہ مر جاتا تو یہ قلق ساتھ لے کر جاتا۔"

سلسبیل کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی گندمی رنگت میں زردی گھل گئی تھی۔ یسار نے نرمی سے اس کی کلائی چھوڑ دی تو وہ وہیں کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے نہیں پتا کہ اسے پروا کہتے ہیں یا نہیں مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کو اس حال میں دیکھنا مجھے تکلیف دے رہا ہے۔ آپ کے زخمی ہونے کی خبر نے مجھے شدید اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔ جب تک آپ کو ہوش نہیں آیا، میری ایسی کیفیت تھی جسے شاید میں بیان نہ کر پاؤں۔ اگر اسے پروا کہتے ہیں تو مجھے آپ کی پروا ہے۔"

"پروا یا محبت؟" یسار نے سوال پوچھا۔

"محبت ہی کی گود سے ہر احساس جنم لیتا ہے۔"

اس ایک فقرے میں ہی اظہار کے تمام رنگ پوشیدہ تھے۔ یسار کے ہونٹوں پر بڑے دنوں بعد کھل کے مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے حد شوق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں صبح ہی انیہ بی کو سب بتا دوں گا۔ وہ داجی سے خود ہی بات کر لیں گی۔ اس کے بعد ماما اور بابا یہاں آ سکیں گے اور پھر میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" ایک جذب کے عالم

www.pklibrary.com

میں کہتا وہ سلسبیل کے دل کی دھڑکنیں منتشر کیے دے رہا تھا مگر اس کے نزدیک ایک کڑی منزل ابھی پار کرنا باقی تھی اور اس کی یاد دہانی بہت ضروری!

"نہیں۔ سب سے پہلے آپ کو داجی کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ وہ سب کچھ جو آپ نے اس دن مجھے بتایا تھا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اب آپ کو یہی کرنا ہوگا۔"

حقیقت کا چٹخا ہوا آئینہ ایک دم سے اس کے سامنے کر دیا گیا تھا۔ اس آئینے میں اس کے اتنے چہرے تھے کہ وہ اصل کی پہچان نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن اسے اصل چہرہ سب کے سامنے لانا ہی تھا۔ سلسبیل جا چکی تھی اور اس کی نیند آنے والے وقت کا سوچ کر اب صحیح معنوں میں اڑی تھی۔

☆☆☆

خان اللہ یار خان بے صبری سے یسار کا اپنے کمرے میں انتظار کر رہے تھے۔ اسے تین دن ہو گئے تھے ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہوئے۔ داجی روزانہ اس کے کمرے میں کچھ دیر کے لیے جاتے تھے مگر اس کے آرام کے خیال سے زیادہ وقت نہیں بیٹھتے تھے۔ آج بھی انہوں نے اس کے کمرے میں جانا چاہا تو رضا نے روک دیا۔ یسار خود ان کے کمرے میں آنے والا تھا۔ خان اللہ یار خان بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ سب ہی اس وقت داجی کے کمرے میں جمع تھے۔ سلسبیل بھی ایک کونے میں رکھے اسٹول پر بیٹھی فکرمندی سے دبیز کارپٹ کو پیر کے انگوٹھے سے کھرچ رہی تھی۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی اور یسار اندر داخل ہوا۔ داجی نے اس پر بھرپور نظر ڈالی اور نم آنکھوں سے اپنی دونوں بانہیں وا کر دیں۔ یسار کو اپنا گلا رندھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ان کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔ داجی کی آنکھوں میں ٹھہرے کب کے آنسو بہہ نکلے۔ فاطمہ ممانی نے یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں کے کنارے شال کے پلو سے دھیرے سے رگڑ دیے۔ ایسے ہر موقع پر اسفند کی یاد دل کو ضرور کھرچتی تھی۔ رضا نے نرمی سے ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر دلاسا دیا۔

داجی نے یسار کو سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا

"میری خطائیں معاف کر دو میرے بچے! میں نے ایک عمر گزار دی اپنی انا کو پالتے پوستے۔ ساری عمر اس کی یاد ستاتی رہی مگر اسے واپس بلانے کا حوصلہ نہ جوڑ سکا۔ اب بھی اگر تم نہ آتے تو شاید یونہی زندگی کی سانسیں پوری ہو جاتیں۔"

"مجھے تو آنا ہی تھا داجی۔ میرے اوپر فرض کا قرض ہے۔ اسے چکانے کے لیے مجھے آنا ہی تھا۔" یسار غیر مرئی نقطے کو دیکھتا سرگوشیانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ داجی نے اس کی بات کو آرزو کے لیے ان کا دل صاف کرنے پر محمول کیا۔ وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولے

"تم نے اپنا فرض پورا کر دیا میرے بچے۔ اب میری باری ہے۔ میں ابھی، اسی وقت اپنی بچی سے بات کرنا چاہتا ہوں، اپنی آرزو کی آواز سننا چاہتا ہوں یسار۔ میری اس سے بات کروا دو۔ اسے کال ملاؤ۔ ابھی اسی وقت۔ میں اسے پاکستان بلانا چاہتا ہوں۔"

یسار ان کے پاس سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا' ان سے نظر ملائے بغیر بولا۔

"وہ آپ سے بات نہیں کر سکتیں داجی! کیونکہ..... کیونکہ وہ پچھلے چار ماہ سے کومے کی حالت میں ہاسپٹل میں پڑی ہیں۔"

خبر نہیں تھی، دھماکا تھا جو کمرے میں ہوا اور سب کے پرخچے اڑا گیا۔ سلسبیل اپنی جگہ پر کھڑی بے بسی سے سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ واحد تھی جسے سب کچھ پہلے سے پتا تھا۔ خان اللہ یار خان کے چہرے پر اس کی بات سے اذیت ضرور اتری تھی مگر پھر بھی انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"یسار۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا ہوا ہے آرزو کو۔ وہ کومے میں کیوں ہے اور تم نے آتے ہی یہ بات

www.pklibrary.com

ہمیں کیوں نہیں بتائی۔"

"کیونکہ..... میں بیمار نہیں ہوں۔ بیمار عباد اب سے چار ماہ پہلے مر چکا اور آپ کی بیٹی اس کے غم میں کومے کی حالت میں پڑی ہے۔ میں حسان ہوں۔ حسان لودھی۔"

موت کی خاموشی سارے میں پھیل گئی تھی۔ سب ایک دم چپ اپنے سامنے کھڑے اس شخص کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو پچھلے ایک ماہ سے ان کے درمیان بیمار عباد بن کے بیٹھا تھا۔ ایک طویل اور دقت طلب سانس کھینچتا، سب کو بنظر غائر دیکھتا حسان لودھی بولنا شروع ہوا۔

☆☆☆

ہاسپٹل کے لمبے کاریڈور میں عباد لودھی اور آرزو دیوانہ وار بھاگتے آئی سی یو کی طرف جا رہے تھے۔ جو خبر انہیں موصول ہوئی تھی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صدمے سے ان کی سانسیں تھم جاتیں مگر نہ جانے کیسے وہ وہاں پہنچے تھے۔ ہاسپٹل اسٹاف نرس کی معیت میں وہ آئی سی یو کے باہر کھڑے بے چینی سے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اندر تھیٹر میں بیمار ہے یا حسان۔ ان کے لب تو بس ساکت رہ کر بھی دعاؤں کی تسبیح کر رہے تھے۔ عباد لودھی نے آرزو کو بازو کے گھیرے میں لے کر آرام دہ ویٹنگ چیئر پر بٹھایا تو وہ ان کے سینے میں منہ چھپائے بلک اٹھیں۔ دونوں ہی ان کے بیٹے تھے۔ ایک کو جنا تھا تو دوسرے کو پالا تھا۔ کچھ پل مزید اس جان لیوا انتظار میں گزرے تھے کہ ایک میل نرس ان کے قریب آیا اور مختصراً کچھ کہتا ایک جانب چل پڑا۔ وہ اس کی تقلید میں ایک کمرے کے بند دروازے کے آگے آ ٹھہرے۔ چند پل ایک دوسرے کو دلاسہ دیتی نگاہوں سے دیکھا اور اندر داخل ہو گئے۔ سامنے پیشنٹ بیڈ پر حسان پٹیوں میں جکڑا بے ہوش پڑا تھا۔ ایک ڈاکٹر اس کے سرہانے کھڑا ان ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آرزو بے چینی سے حسان کی طرف بڑھیں جبکہ ڈاکٹر عباد لودھی کو حسان کی کنڈیشن کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ چھرا اس کی پسلیوں کے آر پار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے خون بہت ضائع ہوا تھا۔ پھر بھی اگلے چند گھنٹوں تک اسے ہوش آ سکتا تھا۔

آرزو، حسان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئیں تو عباد لودھی آہستگی کے ساتھ وہاں سے نکل کر واپس آئی سی یو کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اندر ان کی اولاد، ان کا خون زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ بیمار کا آپریشن چل رہا تھا مگر کسی نے بھی انہیں اس کی اب تک کی کنڈیشن کے بارے میں کچھ نہیں نہیں بتایا تھا۔

وہ پل پل گنتے وہاں تب تک بیٹھے رہے جب تک اندر سے ڈاکٹر نے نکل کر اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار نہیں کر دیا۔ وہ بے یقینی سے ڈولتے قدموں سے چلتے اندر چلے آئے۔ ان کا بیمار ان کی نظروں کے سامنے سر سے پیر تک پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انہیں یہ سب خواب سا لگ رہا تھا، ایک بھیانک خواب۔ ان کی نظروں کے سامنے بیمار کی شرارتیں رقص کرنے لگیں۔ کچن میں گھسا ناشتہ بناتا اور برتنوں کے انبار لگاتا بیمار۔ ماں کو بانہوں میں لیے چٹا چٹ ان کے گال چومتا بیمار۔ زینیا کے بیٹے کو اسکائپ پر پہلی دفعہ دیکھ کر ٹیڈی بیئر کہہ کر اسے چڑاتا ہوا بیمار۔ حسان کی خاطر سب سے لڑنے بھڑنے والا بیمار اور نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر ان سے ماضی کے قصے سننے والا بیمار۔ بھلا بیمار کیسے مرنے والا تھا؟ ان کا بیٹا ایسے کیسے موت چھیننے آ رہی تھی۔

وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس ٹھنڈے کمرے میں بنا چاپ چلتے بیمار کے بیڈ کے قریب آئے اور اس کا زرد مگر گرم ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے گھٹ گھٹ کر رونے لگے۔ کمرے میں ان کی سسکیاں اور دھڑکنیں سناتی مشین کی آواز گڈمڈ ہو رہی تھی۔

www.pklibrary.com

وہ بچوں کی طرح کرلاتے ہوئے زیرلب رب سے اس کی زندگی کی التجائیں کرنے لگے۔ کیلیفورنیا کی یہ رات عبادلودھی پر بہت بھاری تھی۔

☆☆☆

انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ یسار کا ہاتھ تھامے اس پر پیشانی ٹکائے کتنی دیر بیٹھے رہے تھے۔ ان کے اعصاب کو جھٹکا اس پل لگا جب انہوں نے اپنی ہتھیلی پر یسار کے ہاتھ کی انگلی کی خفیف سی حرکت محسوس کی تھی۔ وہ پہلے ٹھٹکے پھر ایک دم بوکھلا کر کھڑے ہوتے یسار کے اوپر جھک گئے۔ وہ اسے دیوانہ وار پکارنے لگے۔ یسار نے بڑی دقت سے دھیرے دھیرے اپنی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی تھی اور ٹھیک اسی لمحے دروازے سے نڈھال سا حسان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے ایک طرف سے بے تحاشا روتی ہوئی آرزو نے تھام رکھا تھا۔ حسان تکلیف سے چیختے اپنے اعصاب کو بمشکل قابو کیے گھسٹتا ہوا یسار کے سرہانے آبیٹھا۔

''یار..... یار اٹھ۔ میں سانی..... اٹھ یار۔ مجھے دیکھ۔ دیکھ کتنی چوٹیں لگی ہیں اور تو آرام سے پڑا ہے۔ میری ہر تکلیف پر تو تڑپ اٹھتا ہے تو اب کیسے مزے سے پڑا ہے۔ اٹھ یار۔''

وہ مسلسل ہلکی آواز میں اسے بلا رہا تھا۔ نہ جانے کس گھڑی اس کی آواز نے یسار کے اندھی کھائی میں اترتے حواسوں کو بیدار کیا اس کے لبوں نے جنبش کی۔ حسان فوراً اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے آیا اور بولا۔

''ہاں۔ ہاں۔ بول یار..... میں سب سن رہا ہوں۔ بول پلیز..... کچھ تو بول.....'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ آرزو اور عباد بھی تھمتی دھڑکنوں کے ساتھ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اس کے کچھ کہنے کے منتظر تھے۔ یسار نے کچھ کہنا چاہا تو خون کی ایک پتلی اور لمبی لکیر اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بہتی ہوئی اس کے کان کی لو کے پیچھے گم ہوگئی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں اذیت ہلکورے لے رہی تھی۔

''سانی..... سانی میرے ماما، بابا کا خیال..... خیال..... پلیز پلیز..... اپنے وعدے نہ بھولنا۔'' وہ باوجود کوشش کے پورا فقرہ نہیں بول پا رہا تھا۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ..... یاد ہے نا۔ سل..... سلسبیل کو اپنا لینا۔ میری ماما کو نانا سے ملوا..... ملوانا ہے۔ پلیز..... پلیز سانی..... بھولنا مت۔''

حسان نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ یسار کی ایسی کسی بات پر برہمی کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے یسار کا ماتھا چوما اور بولا۔

''نہیں بھولوں گا۔ نہیں بھولوں گا۔ یار مت جا۔ مت جا مجھے چھوڑ کر۔'' حسان کی آواز بھی سرگوشی سے بلند نہیں تھی مگر سننے والا سو گیا تھا۔ ہمیشہ کی نیند۔ یسار مر گیا تھا۔ اس کا بھائی، اس کا دوست، اس کا غم خوار اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ یونہی بیٹھا رہ جاتا اگر آرزو کی فلک شگاف چیخ اس کی سماعتوں کو چیرتی ہوئی نہ گزرتی۔ آرزو، یسار سے لپٹ لپٹ کر چلا رہی تھیں۔ ان کا بے قابو ہوتا وجود عبادلودھی نے بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔ خود وہ مرد ہوتے ہوئے بھی بلند آواز سے رونے لگے تھے۔ حسان تھا جو شل ہوتے حواس لیے ابھی بھی یسار کی ادھ کھلی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس کا یار نہیں رہا تھا، ادھر اس نے دائیں ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کیں ادھر عقب میں آرزو کا وجود بے ہوش ہو کر عبادلودھی کی بانہوں میں جھول گیا۔

☆☆☆

آرزو صدمے کے زیر اثر کومے میں چلی گئی تھیں۔ یہ جھٹکا بھی اعصاب شکن تھا۔ زینیا روتی پیٹتی پہنچی تھی۔ کبھی بھائی کا ماتم کرتی تو کبھی نیم مردہ ماں کو پکارتی۔ آرزو کو یسار کا کفن میں لپٹا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ عبادلودھی اور حسان نے جس طرح اسے سپرد خاک کیا تھا انہیں لگتا تھا جیسے وہ خود زندہ درگور ہوگئے ہوں۔ یسار کو اس ٹھنڈی اور تاریک قبر میں اتارتے وقت اس کے دماغ میں یسار

www.pklibrary.com

کی باتیں چکراتی رہیں۔ آج یسار منوں مٹی تلے چلا گیا تھا۔ عباد لودھی چند گھنٹوں میں عمر کے کئی سال پاٹ آئے تھے۔ ان کے وجود کو بڑھاپا ''لگ'' گیا تھا۔

آرزو کی کنڈیشن ہنوز ویسی کی ویسی تھی۔ زینیا چھوٹے سے بچے کے ساتھ گھر بھی سنبھال رہی تھی اور ہاسپٹل میں ماں کے پاس رکنے کی ضد بھی کرتی تھی۔ اس کا شوہر بہت اچھا تھا، وہ چند دن خود قیام کے بعد اسے وہیں چھوڑ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ حسب معمول رات گئے گھر میں داخل ہوا تھا۔ یسار کی موت کے بعد اس کی زندگی جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ جاب پر بھی ریگولر نہیں جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی حسان کو کچھ بھی سمجھانا بے سود ہوگا لیکن اب حالات اس نہج پر آ چکے تھے کہ اسے یسار سے کیے گئے وعدے یاد دلانے تھے۔ ڈاکٹرز کے مطابق کوئی ایسا تعلق، کوئی رشتہ جو آرزو کے بے حد قریب ہو اسے سامنے لانا ہوگا۔ اور عباد لودھی جانتے تھے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔

حسان دبے پاؤں لونگ روم میں داخل ہوا تو آتشدان میں جلتی آگ اور اس کے قریبی صوفوں پر بیٹھے زینیا اور بڑے بابا کو دیکھ کر وہ چونکا ضرور مگر حیران نہیں ہوا۔ وہ سلام کرتا، ڈھیلے قدموں سے چلتا بڑے بابا کے پیروں میں وہیں کارپٹ پر ٹک گیا اور اپنا سر ان کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ عباد لودھی دھیرے سے اس کا سر سہلانے لگے۔ زینیا کچن میں کافی اور اس کے کھانے کے لیے کچھ لینے چلی گئی۔ عباد لودھی نے تھکن زدہ سانس خارج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''کیوں سارا دن یہاں وہاں پھرتے ہو سانی؟''

(آج کتنے دن بعد اسے کسی نے اس نام سے پکارا تھا۔ اس کا دل مسلا گیا تھا جیسے)

''میں یہاں وہاں کہاں پھرتا ہوں بڑے بابا۔ بس یار کے پاس جاتا ہوں۔''

''اس کے پاس تو چلے جاتے ہو لیکن کیا اس سے کیے وعدے بھول گئے ہو حسان؟''

وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ اس کی نظروں میں تعجب تھا۔ عباد لودھی اس کی حیرت بھانپ کر بولے۔

''وہ سب ہی کا یار تھا حسان! جن جن باتوں کا عہد وہ تم سے لے کر گیا، ان ہی وعدوں کا وہ مجھے بھی ضامن بنا کر گیا۔''

''اور مجھے بھی۔'' زینیا ٹرے پکڑے لونگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی تو حسان کو لگا جیسے یسار یہیں کہیں کھڑا شرارت سے اسے دیکھ رہا ہے۔ یعنی وہ ساری دنیا کو راز دار بنا گیا تھا۔

''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے پاکستان جانے کے بارے میں حسان؟''

عباد لودھی نے اس سے پوچھا تو وہ ایک خالی خالی نظر ان پر ڈال کر بولا۔

''کچھ بھی نہیں ابھی تک تو۔ کیا سوچنا چاہیے مجھے بڑے بابا۔ بھلا یار کے بعد کچھ سوچنے کو رہ گیا ہے کیا؟''

''کیوں۔ کیا تمہیں آرزو کا خیال نہیں ہے جس کو تم اپنی ماں کہتے ہو۔ کیا اس کو اس حال میں ہی چھوڑ دو گے؟''

حسان کے حواس جھنجھنا اٹھے۔ اس طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اسے آرزو ماما کی فکر تھی مگر وہ یسار کے غم میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ ان کی حالت کی سنگینی بھی پس پشت ڈال دی تھی۔ اس کے دل کو ملال نے گھیر لیا۔ بھلا کسی ماں کے جوان بیٹے کو کھو دینے سے بڑا دکھ تھا اس کا؟ وہ پورا چوکنا ہو کر سیدھا ہوا اور عباد لودھی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے رسان سے بولا۔

''جو آپ کہیں۔ جیسا آپ کہیں۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گا بڑے بابا۔ آرزو ماما ٹھیک ہو جائیں، آج سے یہی میرے نزدیک سب سے اہم ہے۔''

www.pklibrary.com

عباد لودھی نے فرط محبت سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ زینیا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اسے تو اپنے دونوں بھائی جان سے پیارے تھے۔

وہ حسان کو بغور دیکھتے رہے، یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''یسار۔''

''جی بڑے بابا۔'' حسان تڑپ کے بولا۔

''تمہیں یسار بن کر پاکستان جانا ہو گا حسان۔'' عباد لودھی خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ''تم حسان بن کر نہیں جاؤ گے۔ کیونکہ وہاں تمہیں کوئی نہیں جانتا ہو گا۔ شاید تمہیں میرا بھتیجا ہونے کے ناتے تمہارے نانا ملنا بھی گوارا نہ کریں۔ لیکن اگر تم ان کے نواسے کی حیثیت سے جاؤ گے تو وہ تم سے اپنی ناراضی کا اظہار تو ضرور کریں گے مگر نفرت نہیں کر پائیں گے۔ کرنے کو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے بیٹا کہ انہیں یسار کی موت اور آرزو کی حالت کے بارے میں بتا دیا جائے تو شاید ان کے دل نرم ہو جائیں مگر مجھے پاکستان میں موجود میرے کزن نے بتایا ہے کہ تمہارے ماموں کی موت کے بعد تمہارے نانا کو فالج ہو چکا ہے۔ اگر یہ خبر انہیں ایک دم سے دی گئی تو نہ جانے ان کے کمزور اور بوڑھے اعصاب سہہ بھی پائیں گے یا نہیں۔ اس لیے تمہیں یسار بن کر وہاں جانا ہو گا حسان۔ ان کے دل نرم کرنے ہوں گے۔ تمہاری آرزو ماما کو اپنے داجی سے اس قدر محبت ہے کہ مجھے یقین ہے اگر وہ اسے پکاریں تو آرزو کوما سے باہر آ سکتی ہے۔ ایک چانس ہے بیٹا۔ اور تمہیں یہ کام کرنا ہے حسان۔ ہم سب کی خاطر۔ یسار کی خاطر۔''

وہ گم صم بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔ اس کے حواس شل سے ہو رہے تھے۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ وہاں جا کر سچویشن کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس نے ہامی بھر لی۔

☆☆☆

خان اللہ یار خان کے وسیع و عریض کمرے میں ایسی خامشی چھائی تھی جیسے کسی نفس میں سانس باقی نہ رہ گئی ہو۔ سب ہی حسان کا چہرہ تک رہے تھے سوائے سلسبیل کے جسے اس شام وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔ زہرہ خاتون کو یسار کی تصویر دکھا کر اور اپنے سامنے بیٹھے حسان کے چہرے کے نقوش میں فرق نے فوراً یہ باور تو کرا دیا تھا کہ یہ لڑکا یسار نہیں مگر وہ خاموش کیوں رہی تھیں تو اس کے پیچھے محض یہ وجہ تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے شور مچانے سے آرزو کے لیے راہیں ہموار کرنے آیا یہ لڑکا ناکام ہو جائے۔ وہ کوئی چور اچکا تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ انہوں نے خود اسے موبائل پر عباد لودھی کے ساتھ ویڈیو کال کرتے دیکھا تھا۔

عباد لودھی ان کے داماد تھے، انہیں پہچاننے میں تو کم از کم وہ کوئی دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ حسان کی پشت پر کچھ فاصلے پر ذرا ہٹ کر کھڑی زہرہ خاتون نے داماد کی ڈھیروں بلائیں لی تھیں۔ انہیں خان صاحب کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ اسی وقت سامنے آ کر ہر بندش ختم کر دیتیں اور آرزو کو بلا کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتیں۔ مگر یہ تو انہوں نے گمان بھی نہ کیا تھا کہ آرزو ان کی بیٹی دنیا و مافیہا سے بے خبر بستر پر مردے کی طرح پڑی ہے۔ ان کی بیٹی کس جان لیوا صدمے سے گزر گئی اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔

سب سے پہلی سسکی آواز کی صورت زہرہ خاتون کے حلق سے برآمد ہوئی اور کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کے بعد فاطمہ ممانی بھی رو پڑیں۔ دیکھا دیکھی ہنی بھی بچوں کی طرح ماں سے لپٹ گئی اور بلک اٹھی۔ حسان نے جھجکتے ہوئے داجی کی اور دیکھا، وہ واحد تھے جن کے چہرے کے تاثرات پتھریلے سے محسوس ہو رہے تھے۔ حسان دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں جوڑے ان سے پیشانی ٹکائے ان کے ردعمل کے لیے بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اس نے بے یقینی سے یک دم گردن موڑ کر داجی کو

www.pklibrary.com

دیکھا۔ داجی کی آنکھوں سے چشمے پھوٹ نکلے تھے۔ وہ زاروقطار رو رہے تھے۔ ان کو یوں دیکھ کر سبھی کے دل مسلے گئے تھے۔ سلسبیل تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے سینے سے جا لگی۔ اس کے داجی۔ اس کے پیارے داجی۔ کیسی آن بان تھی ان کی اور آج وہ نہ جانے کس کس غم کو بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ زندگی نے کیسا کڑا امتحان لیا تھا ان سے۔ ان کی دو ہی اولادیں اور دونوں ہی ان سے بچھڑ گئیں۔ ایک کو موت لے گئی اور دوسری موت کے بستر پر تھی۔ حسان انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آرزو ماما کو ڈاکٹرز کے بقول کوئی بے حد اپنا ہی زندگی کی طرف لوٹا سکتا تھا اور داجی سے زیادہ پیار تو شاید انہوں نے یسار سے بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے باپ سے ان کی محبت کا تو وہ خود گواہ تھا۔ داجی کے ہر جنم دن پر وہ صدقہ خیرات کرتی تھیں۔ گھر میں کیک بیک کر کے بند کمرے میں اکیلی ہی سیلیبریٹ کرتی تھیں اور خوب سارا روتی تھیں۔ ایسے میں عباد لودھی ان سب کو باتوں میں الجھائے رکھتے تھے۔ وہ بیوی کے مزاج شناس تھے اس لیے مکمل تنہائی فراہم کرتے تھے' کبھی بھی مخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

حسان جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ وہ پورا ہو چکا تھا۔ وہ آزردگی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہاں مزید رکنے کا جواز نہیں سوجھ رہا تھا لہٰذا باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑا۔

''اپنے داجی کے سینے سے نہیں لگو گے حسان؟''

یہ آواز اس کی پشت سے ابھری تھی اور بلاشبہ خان اللہ یار خان کی تھی۔ وہ بے یقینی سے پلٹا۔ داجی بانہیں کھولے اس کے منتظر تھے۔ مزید ایک پل کی بھی تاخیر کیے بنا وہ ان کے سینے سے جا لگا۔ حسان کا ضبط جواب دے گیا۔ کب کے ٹھہرے آنسو بہہ نکلے۔

''مجھے معاف کر دو بچے۔ میں نے اذیت میں ایک عمر گزار دی۔ مجھے معلوم ہو بھی گیا کہ میری آرزو بے گناہ ہے تب بھی جھوٹی انا کی کھوکھلی پوٹلی کندھوں پر اٹھائے رہا۔ اسی انتظار میں رہا کہ آرزو خود آئے اور مجھ سے معافی مانگے، میری آرزو بھی ایسی ناک والی نکلی کہ کتنا ظالم بہانہ بنا ڈالا مجھے جھکانے کا۔ مجھ سے بڑا غم دل پر لادے وہ مجھ پر سبقت لے گئی۔ مجھے اپنی آرزو کو ہوش میں لانا ہے حسان۔'' وہ اسے اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے پورے جوش سے بولے۔ ''تم..... تم ابھی میری بات کراؤ اس سے۔ دیکھنا۔ وہ میری آواز سن کر ضرور جاگے گی۔ وہ اپنے داجی کو ملے بغیر کبھی نہیں جا سکتی۔ تم میری بات کراؤ۔''

شش و پنج میں مبتلا حسان نے رضا کا لیپ ٹاپ منگوایا اور اسکائپ پر عباد لودھی کو کال ملائی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین داجی کی گود میں رکھ کر خود وہ ان کے کندھے سے کندھا جوڑ کر یوں بیٹھ گیا جیسے داجی کا جگری یار ہو۔ سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ سلسبیل نے زیر لب اسے کچھ کہا اور مسکراہٹ چھپاتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ زہرہ خاتون بھی اٹھ کر داجی کے دوسری طرف آ کر بیٹھ گئیں۔ فاطمہ ممانی گرما گرم چائے کا کہنے کچن کی طرف گئی تھیں۔ سارے میں رنگ ٹون کی آواز مرتعش ہو کر سب کے جی گرما رہی تھی۔ ساتویں بیل پر کال پک کر لی گئی اور عباد لودھی کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا۔ انہوں نے قدرے تھکے تھکے انداز میں کال پک کی تھی لیکن اگلے ہی پل انہیں کرنٹ لگا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مسلا اور شرٹ کی اوپری جیب سے نظر کی عینک نکال کر فوراً آنکھوں پر لگائی۔ حسان کو داجی کے پہلو سے لگا دیکھ کر عباد لودھی کی آنکھ بھر آئی۔ ان کا بیٹا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ داجی نے حسرت آمیز لہجے میں عباد لودھی سے کہا۔

''عباد۔ بیٹا مجھے میری آرزو دکھاؤ۔ اسے میری آواز سناؤ بیٹا۔ وہ جاگ جائے گی۔ اسے بچپن سے عادت تھی، صبح صرف میری آواز سے اٹھتی تھی۔ آج بھی وہ میری آواز سے اٹھے گی۔ اسے کہو کہ اس

www.pklibrary.com

Reading Point

Http://readingpointpk.blogpost.be//

کے داجی اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

عباد لودھی اپنی دونوں آنکھوں کو جھپک کر اثبات کا اشارہ کرتے آرزو کے کمرے کی طرف چل دیے۔ سب ہی بچے آرزو پھوپھو کے اسکرین سے نظر آتے خوبصورت گھر کو ستائش سے دیکھ رہے تھے۔ زہرہ خاتون نے نظروں ہی نظروں میں کئی بلائیں لے ڈالیں۔

عباد لودھی ایک کمرے میں داخل ہوئے اور موبائل کی اسکرین کا رخ آرزو کے بیڈ کی جانب پھیر دیا۔ سامنے وسیع بیڈ کے وسط میں آرزو کا سانس لیتا بے سُدھ وجود تھا۔ ان کی اٹینڈنٹ ان کے پاس سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر جا کھڑی ہوئی۔ داجی اور زہرہ خاتون سکتہ زدہ سے یک ٹک آرزو کو دیکھے جا رہے تھے۔ کتنے عرصے بعد یہ جان سے پیارا چہرہ دیکھا تھا۔ کتنا وقت گزر گیا تھا۔ کیسے کیسے حادثات ہو چکے۔ آرزو کا حسن و جمال کی مثال چہرہ زرد رو ہو چکا تھا۔ وہ پلکیں موندے دنیا مافیہا سے بے خبر نہ جانے کن جہانوں کی سیر پر تھیں۔ زہرہ خاتون کے پیٹ میں مارے تکلیف کے گرہیں سی پڑ گئیں۔ داجی کی آنکھ سے ایک آنسو مزید ٹپکا اور پھر انہوں نے اپنی آنکھیں سختی سے پونچھ لیں۔

"آرزو!" ایک گونج دار پکار تھی جو خان اللہ یار خان کے حلق سے نکلی تھی۔ "آرزو۔ اٹھو بیٹا۔ میں تمہارا داجی..... تمہارا داجی آرزو۔ اپنے داجی کو معاف کردو۔ ان کی تکلیف کم کرو آرزو۔ میری لور (بیٹی) ہوش میں آجاؤ۔ اپنے داجی سے بات کرو۔ اپنی ادے سے بات کرو آرزو۔ جاگ جاؤ آرزو۔"

موبائل اب آرزو کے کانوں کے قریب رکھا تھا اور خان اللہ یار خان مسلسل اسے پکارے جا رہے تھے۔ عباد لودھی جانتے تھے کہ وہ ان کی ہر آواز سن رہی ہیں۔

☆☆☆

وہ اسے بغور دیکھنے لگے۔ انہوں نے آنکھیں سکیڑیں۔ پھر پلکیں جھپک کر دوبارہ دیکھا تو ان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ آرزو کے پیروں میں جنبش ہوئی تھی۔ اس کے لحاف میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی تھی اور یہ ان کا وہم نہیں تھا۔ یہ ہرگز بھی ان کا وہم نہیں تھا۔ داجی نے چلا کر زہرہ خاتون کو پکارا۔

"خانم۔ خانم۔ آرزو کو دیکھو۔ خانم، آرزو کے پیر ہلے ابھی۔ حسان۔ رضا۔ فاطمہ۔ تم نے دیکھا۔"

آرزو کے جسم میں مزید کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی مگر آرزو کی اٹینڈنٹ ان پر جھکی ہوئی تھی اور ساتھ وہ مسلسل اس مشین کی ریڈنگ چیک کر رہی تھی جو مختلف نالیوں کے ساتھ آرزو کے جسم سے منسلک تھی۔ اس کے بقول آرزو کے جسم میں حرکت ہوئی تھی اور اب انہیں فوری طور پر ہاسپٹل لے جانا ضروری تھا۔

☆☆☆

آرزو کو فوری طور پر آئی سی یو میں رکھا گیا اور ان کی نیوروٹرمنٹس اسٹارٹ کر دی گئیں۔ اور اگلے بیس گھنٹوں کے بعد انہیں عباد لودھی نے آرزو کے کوما سے نکل آنے کی نوید سنا دی۔ زینیا بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور پل پل کی رپورٹنگ کر رہی تھی۔" خان ولا" میں جشن کا سماں تھا۔ ہر کوئی بے حد خوش تھا۔ آرزو کے وقت کے چند ملازمین ابھی تک یہیں تھے، ان کی بھی خوشی دیدنی تھی۔ خان اللہ یار خان اور زہرہ خاتون یوں مسرور تھے جیسے آج ہی آرزو کی پیدائش ہوئی ہو۔ خان صاحب بار بار حسان کی پیشانی چومتے، یہ سب اسی کے خلوص کا ثمر قرار دیتے۔

حسان واپس جانا چاہ رہا تھا مگر عباد لودھی نے اسے روک دیا۔ ان کا ارادہ خود پاکستان آنے کا تھا بس آرزو کے تھوڑا سا اسٹیبل ہونے کا انتظار تھا۔

ابھی آرزو کی زیادہ کسی سے بات چیت نہیں کروائی گئی تھی۔ خان صاحب نے بھی عباد کو منع کر دیا کہ آرزو کو ان کے متعلق کچھ نہ بتایا جائے، ان کی بیٹی کے اعصاب ابھی کمزور ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خوشی سہار نہ پائے۔ ویسے بھی ہوش میں آتے ہی آرزو کو پیار کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ بے تحاشا روتی رہی تھیں۔ ان کے قرار کی خاطر عباد لودھی نے انہیں بتا دیا تھا کہ ان

www.pklibrary.com

کے داجی، ان سے راضی ہو گئے ہیں اور وہ انہیں جلد پاکستان ان سے ملوانے لے جانے والے ہیں۔

وہ بے یقینی سے شوہر کا منہ دیکھتی رہی تھیں اور ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ حسان کا وہ مسلسل پوچھ رہی تھیں عباد لودھی کو انہیں ساری بات بتانی پڑی تھی۔ آرزو ششدر تھیں کہ ان کی بے ہوشی کے عالم میں اتنا کچھ ہو گیا۔ حسان مسلسل ان سے رابطے میں تھا۔ اس سے بات کر کے انہیں یوں ہی لگتا جیسے یسار انہیں دلاسا دے رہا ہو۔ عباد لودھی نے جلد از جلد انتظامات مکمل کیے اور دو ہفتے بعد وہ اور آرزو ستائیس سال بعد پاکستان جا رہے تھے۔

☆☆☆

ایرپورٹ پر قدم رکھتے ہی عباد لودھی نے فوراً آرزو کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ ان کی ذہنی حالت سے خائف تھے۔ بہت سنگین بیماری سے اٹھی تھیں وہ، ایسے میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ جذبات میں آ کر ان کی حالت مخدوش ہو۔ خود وہ مرد ہو کر اپنی خوشی اور دلی کیفیات کو بیان کرنے سے قاصر تھے تو آرزو تو نازک اطوار اور جذبات رکھنے والی عورت تھیں جو ذرا سی احساسات کی گرمی سے موم کی طرح پگھلتی تھیں۔

انہیں لینے کے لیے حسان کے ساتھ سب ہی گھر والے آئے تھے سوائے زہرہ خاتون اور خان اللہ یار خان کے۔ بڑا عجیب منظر تھا جب آرزو، فاطمہ ممانی کے گلے لگی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ لے کر دیکھتی رہیں۔ اسفند یار کی بیوی تھی یہ۔ بڑی چاہ سے بیاہ کر لایا ہوگا۔ فاطمہ ممانی ان کی دور پرے کی رشتے دار تھیں اور اپنے چھوٹے بھائی کی محبت کی آرزو تب سے رازدار تھیں جب وہ ابھی اپنے داجی کے گھر میں تھیں۔ رضا اور ہنی کے منہ چومتے، ان کی پیشانیوں کے بوسے لیتے ان کا جی نہیں بھر رہا تھا۔ اور جب وہ سب سے پیچھے کھڑے حسان کی طرف بڑھیں تو عباد لودھی پوری وارفتگی کے ساتھ اس کے گلے لگے ہوئے تھے۔

آرزو بے خود سی اس کے قریب آئیں اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔

''سانی! تمہارا یار تو مجھے چھوڑ گیا، تم بھی مجھے چھوڑ آئے۔ تم دونوں کو اپنی ماں کا خیال نہ آیا۔''

وہ اس کے گلے لگی سسکتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ طویل وقفے کے بعد حسان سے مل رہی ہیں۔ حسان نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا بس خاموشی سے ان کا باٹل گرین اسکارف سے ڈھکا سر چوم لیا۔ ویسے بھی یسار کا نام لینا ہی اس کی یاد کو کھرنڈ لگے زخم کی طرح چھیل دیتا تھا۔ کوئی اس کا سینہ چیر کے دیکھتا کہ یسار اس کے لیے کیا تھا۔

جوں جوں گھر نزدیک آتا جا رہا تھا توں توں آرزو کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ عباد لودھی نے ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح ان کے شانوں پر بازو دراز کیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ ان کے لیے آرزو آج بھی وہی تھیں جو ستائیس سال پہلے۔ ویسی ہی سہمی ہوئی ہرنی سی۔ ویسی ہی سنہری تتلی کے پروں سی نازک۔

گاڑی حسان چلا رہا تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر ہارن دیا تو گیٹ خود کار طریقے سے کھلتا چلا گیا۔ ایک طرف کھڑے گارڈ نے ہاتھ سے علامتی سلام کیا۔ حسان نے گاڑی اندر وسیع و عریض پورچ میں لا ٹھہرائی۔ آرزو حق دق سب جگہ نظر دوڑا رہی تھیں۔ سب کچھ ویسا کا ویسا تھا بس معمولی تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے سے باغ نما لان پر نگاہ دوڑائی تو ہونٹ کاٹ کر رہ گئیں۔ کونے میں آج بھی آم کا درخت تھا اور اس کی ڈال پر خستہ حال جھولا اب بھی لپٹا ہوا تھا۔ یہ جھولا داجی نے ان کے لیے ڈالا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اسے اتارا نہیں گیا تھا۔ وہ فاطمہ ممانی کی معیت میں اندر کی جانب بڑھیں۔

کونے کھدروں سے پرانے ملازمین نے جھانکنا شروع کر دیا تھا مگر وضع داری ان میں بھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اتنے عرصے بعد آئی آرزو سے اس کے ماں باپ سے پہلے ملنا نامناسب ہوگا۔ رضا اور ہنی مسلسل چونچیں لڑا رہے تھے۔ حسان نے آرزو اور عباد کو بتایا کہ یہ دونوں جب بہت زیادہ

www.pklibrary.com

ایکسائیٹڈ ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے پر کترتے ہیں۔ ہنی کے ہاتھ میں اب بھی حسب معمول چپس کا پیکٹ تھا۔ حسان کی بات پر وہ سب مسکرا دیے۔

اندر داخل ہوئے تو ناک کی سیدھ میں لونگ روم تھا۔ یہاں آ کر آرزو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خواب کی سی کیفیت میں ہوں۔ ان کا دماغ مسلسل ماؤف تھا۔ آنکھیں دھندلاہٹ کا شکار۔ وہ خود ہی سب سے پہلے دائیں جانب مڑ گئیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی راہداری کے بعد داجی اور زہرہ خاتون کا کمرہ تھا۔ ان کے داجی۔ ان کی اماں۔

دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ باقاعدہ کپکپا رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی پشت پر عباد کھڑے تھے، جنہوں نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازے کے عین سامنے خان اللہ یار خان وہیل چیئر پر بیٹھے اسی طرف دیکھتے اپنی لور کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ان کے پہلو میں زہرہ خاتون بھی متورم آنکھیں لیے موجود تھیں۔ آرزو پتھر کی ہو گئیں۔ خان اللہ یار خان نے دونوں بازو وا کیے اور آرزو چھوٹے بچے کی طرح ان کے سینے سے جا لگیں۔ ستائیس برس۔ ستائیس برس کی تڑپ تھی جو ان کے آنسوؤں میں تھی۔ ستائیس برس کا دکھ تھا جو پانی بن کے بہہ رہا تھا۔ اور چار ماہ پرانا شدید ترین صدمہ تھا جو آہوں کی صورت ان کی زبان سے جاری تھا۔

"داجی!..... میرا پیار..... داجی! میرا بچہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ داجی آپ کو خبر بھی نہ ہوئی اور مجھ پر کیا بیت گئی۔ میں نے آپ کو بہت پکارا داجی! راتوں کی تاریکیوں میں، دن کے اجالوں میں۔ میں نے آپ کو پل پل یاد کیا داجی۔ میرا بیٹا نہیں رہا۔ وہ مجھے آپ سے ملوانے کی حسرت لیے دنیا سے چلا گیا داجی۔ آپ نے مجھے بہت دیر سے بلوایا میرے داجی۔"

وہ بے تحاشا روتی جاتی تھیں اور بے تحاشا شکوے کیے جاتی تھیں۔ خان اللہ یار خان کے کتنے ہی آنسو آرزو کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ ان کو [illegible]

یونہی اسے سینے سے لگائے عمر تمام کرتے۔

انہیں اپنا کلیجہ پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کیسے اپنی بیٹی کے دکھوں کا ازالہ کرتے جو محض ان کی انا کی خاطر اس نے اٹھائے تھے۔ زہرہ خاتون نے روتی بلکتی آرزو کو پیچھے سے تھام کر رخ موڑا اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ان کے ممتا کے بھڑکتے بھانبھڑ پر ٹھنڈی پھوار برس گئی تھی۔ جس تکلیف میں انہوں نے ستائیس سال کاٹے تھے کیا ان کا کوئی ازالہ تھا؟ وہ تو بیوی ہونے کے ناتے کھل کر رو بھی نہ سکی تھیں کبھی۔

کمرے میں موجود ہر شخص رو رہا تھا۔ دروازے سے لگ کر کھڑی سلسبیل پر مسلسل حسان کی نگاہیں تھیں جو بار بار چھوٹی انگلی سے آنکھ کا پانی جھٹکتی تھی۔ بڑا حسین نظارہ تھا۔ دھنک رنگوں جیسی کومل لڑکی بار بار اوس کی بوندیں ٹپکائے جا رہی تھی۔ عباد نے حسان کی چوری پکڑ لی تھی۔

وہ مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے

"حسان۔ میری جان۔ تمہارا شکریہ۔ آج صرف تمہاری وجہ سے تمہاری آرزو ماما زندہ ہیں۔ اگر تم اتنی کوشش نہ کرتے تو شاید ہم پیار کے بعد آرزو کو بھی کھو چکے ہوتے اور یقین کرو اگر ایسا ہوتا تو پھر میرے لیے سانسیں پوری کرنا ناممکن ہو جاتا۔ مجھ سے اپنے بیٹے کی موت کا بار نہیں اٹھایا جاتا تو اگر آرزو کو کچھ ہو جاتا تو میں بالکل ڈھے جاتا۔"

"ایسا مت کہیں بڑے بابا۔ آپ دونوں میرے ماں باپ ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں بھی آپ ہی کی طرح کسی پیاری سی لڑکی سے محبت کروں۔ اور آپ کی عمر تک پہنچ کر بھی اس کا ایسا ہی شیدائی رہوں۔ لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے بڑے بابا، آپ مجھے شیدائی بنانے کا انتظام کریں۔"

وہ انتہائی سنجیدگی سے بولتے بولتے یک دم ٹون بدل کے بولتا عباد صاحب کو ہنسا گیا۔ ان کی ہنسی کی آواز سن کے خان اللہ یار خان یک دم چونک کر ان کی [illegible]

www.pklibrary.com

لگا۔ حسان نے ان کی یہ حالت دیکھی تو اپنی ہنسی چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ مگر اگلا پل حیران کن ضرور تھا پر غیر متوقع نہیں۔

عباد صاحب کو سسر نے گلے لگنے کا شرف عطا کیا تھا۔ وہ ان کے کان میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ حسان سمجھ گیا کہ ماضی کی کوتاہیوں کی معافی تلافی۔ وہ غیر محسوس انداز میں چلتا ہوا دروازے کی چوکھٹ تک آیا اور سلسبیل کے قریب سے باہر جاتے ہوئے سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے سب کو ملا دیا بیلا۔ اب تم مجھ سے آن ملو۔"

سلسبیل کے گال دہکتے آتش فشاں بن گئے۔ حسان باہر جا چکا تھا مگر وہ جیسے ایک حرف "بیلا" میں جکڑی گئی تھی۔ کیسا البیلا سا نام دیا تھا اس نے۔ اس کا رواں رواں حسان کی بات پر سنسنا اٹھا تھا۔ اس نے سب کو بنظر غائر دیکھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب ہی نے اس کے چہرے کا اڑتا رنگ دیکھ لیا تھا۔ وہ الٹے پاؤں ٹھسکتی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے کی اور چل دی۔ دل کی دھڑکن اب سے پہلے اس لے پر کبھی نہیں دھڑکی تھی۔

☆☆☆

آرزو نے حسان کے لیے سلسبیل کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ بھیجی پر اس قدر فریفتہ ہوئی تھیں کہ جب بھی سامنے آتی اسے بے خودی تکتی رہتیں۔ وہ بہت زیادہ آرزو سے مشابہ تھی مگر اس کی آنکھوں کی رنگت ان کی بناوٹ اور ہونٹوں کی تراش اسفند سے ملتی تھی۔ چھوٹے لاڈلے بھائی کی یاد بات بات پر آنکھ بھر لاتی تھی۔ انہوں نے دو جان سے پیارے رشتے کھو دیے تھے۔ دونوں سے محبت کا کوئی پیمانہ ہی نہیں تھا۔ سلسبیل اسی بھائی کی نشانی تھی جسے وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔

خان اللہ یار خان کو اب کوئی اعتراض نہیں تھا، آرزو ان سے جان بھی مانگتی تو وہ ہرگز نہ جھجکتے۔ فاطمہ ممانی بیٹی کی مرضی سے واقف تھیں، اس لیے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ زہرہ خاتون کے لیے حسان بالکل پیار کی طرح تھا۔ انہوں نے اسے نواسے کے طور پر پہلے دن سے بے حد چاہا تھا۔ وہ اس کی حقیقت سے واقف بھی ہو گئی تھیں تب بھی ان کی محبت میں فرق نہیں آیا تھا۔

خان صاحب نے لونگ ہال میں سب کو اکٹھا کر کے آرزو کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ رضا اور ہنی نے خوشی کا نعرہ مارتے ہوئے حسان کو یوں مبارک باد دی تھی جیسے وہ رشتہ مانگنے والوں کے ساتھ ہوں، دینے والوں کے نہیں۔ فاطمہ ممانی سب کا منہ میٹھا کروانے لگیں۔ ملازمائیں کھانے پینے کے سامان سے ٹیبل سجانے لگیں تو حسان نے اردگرد نگاہ دوڑائی کہ شاید کسی کونے کھدرے میں سلسبیل کھڑی دکھائی دے جائے مگر وہ نہیں تھی۔ نظر واپس پلٹتے پلٹتے عباد صاحب پر آ رکی تو وہ اسے چڑانے والے انداز میں دیکھتے بھنویں اچکا رہے تھے۔ حسان نے ناک سکوڑ کر انہیں دیکھا۔ عباد صاحب نے اس کو ہاتھ کی انگلی سے اوپر کا اشارہ کیا۔ حسان کھل اٹھا یعنی سلسبیل اوپر تھی۔

وہ ہنی اور رضا کو بمشکل ایک دوسرے سے لڑوا کر وہاں سے کھسک لیا۔ وہ سیدھا چھت پر گیا تھا۔ جب سے حسان نے اس کی ایک پینٹنگ کا ناس کیا تھا تب سے اس نے اپنا ایزل اور رنگ وغیرہ چھت کے اسٹور میں ہی رکھ دیے تھے۔ فارغ اوقات میں وہ چھت پر ہی پائی جاتی تھی۔ حسان اوپر آ کر بنا آہٹ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ سلسبیل کے کانوں میں اس کی آواز پڑی۔

"بیلا۔"

وہ جھٹکا کھا کر پلٹی تو اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ حسان نے شرارتاً کہا۔

"چلو منہ واپس ادھر کرو، میں دوبارہ پکارتا ہوں۔ ضروری نہیں ہر دفعہ مجھے ناکامی ہو۔ اس بار مجھے یقین ہے تم مجھ سے آ ملو گی۔ بیلا۔"

www.pklibrary.com

انچ کے فاصلے پر کھڑی گھبراہٹ پر قابو پاتی، چہرے پر آئی ریشمی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ حسان چند پل بالکل خاموشی سے اس کا حسین چہرہ دیکھتا رہا، جس کی تابنا کی سورج کی ڈھلتی کرنوں نے دوچند کردی تھی۔ حسان نے نظر اس کے کینوس کی اور پھیری۔ پھولوں سے بھرے کنج میں دو سنہری پروں والی چڑیاں ایک دوسرے کی سنگت میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ منظر نامکمل ہوتے ہوئے بھی مکمل تھا۔ اس نے ایک آسودگی سے بھرپور سانس خارج کرتے ہوئے سلسبیل سے کہا۔

''جس وقت یسار نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو میں تمہیں اپناؤں گا۔ میں پاکستان جاؤں گا اور وہ سب کچھ کروں گا جو اس نے کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا، تب میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا بیلا۔ لیکن جس گھڑی میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تب میری ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔ اور اب یہ عالم ہے کہ تم سے جدائی کا سوچوں بھی تو دل رکنے لگتا ہے۔ یسار جاتے جاتے مجھ پر بہت بڑا احسان کر گیا بیلا۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا میں اور تم اسے بھول جائیں۔ وہ اتنا پیارا شخص بھلائے جانے کے قابل ہرگز نہیں۔''

''میں اسے کبھی نہیں بھولی حسان۔'' سلسبیل بے حد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''وہ اپنی ماما سے بے انتہا پیار کرتا تھا اور ان کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تو کیا ایسا انسان جو سب سے صرف پیار ہی پیار کرتا ہو، کیا ایسے شخص کو بھلایا جا سکتا ہے؟''

وہ حسان سے پوچھ رہی تھی، جس کا رخ ڈھلتے سورج کی جانب تھا۔ اس نے آنکھ کے کنارے آیا آنسو ہاتھ کی انگلی سے نامحسوس انداز میں جھٹکا اور سلسبیل کی طرف پلٹا۔

''یسار جیسے کمینے بھلائے نہیں بھولتے۔ وہ کل بھی میرے اندر بستا تھا، آج بھی وہیں کا وہیں ہے اور مجھے پتا ہے کہ وہ ایسا لیچڑ ہے کہ کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والا۔''

سلسبیل منہ کھولے حیرت سے حسان کو دیکھ رہی تھی جو یسار کے بارے میں ایسے بات کر رہا تھا جیسے وہ سامنے کھڑا ہو۔ حسان نے اس کی حیرانی نظر انداز کرتے ہوئے اسے آنکھ ماری۔ سلسبیل نے سٹپٹا کر نگاہ پھیری اور زیر لب کچھ بڑبڑائی۔

''یہ تم مجھے منہ ہی منہ میں کیا بولتی ہو بیلا۔ ذرا باہر نکالو نا ان الفاظ کو تو پھر دیکھو میں تم سے کیسے نبٹتا ہوں۔''

اس نے دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے پوری دل جمعی سے اسے گھورنا شروع کیا۔

''میں یہ کہتی ہوں کہ کاش۔ کاش ایک بار میں اس آدمی سے اپنی پینٹنگ برباد کرنے کا بدلہ لے سکوں۔ ایسے۔''

ساتھ ہی اس نے پلیٹ سے اٹھایا پینٹ برش حسان کے بائیں گال پر لتھیڑ دیا۔ سرخ رنگ اس کے وجیہہ چہرے پر چھب دکھا گیا۔ وہ اس حرکت کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے جواباً پلیٹ پکڑی اور سلسبیل کی جانب بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ اس کے سینے پر ہاتھوں سے دباؤ ڈالتی پیچھے کو دھکا دیتی، وہاں سے بھاگ لی تھی۔ حسان کے ہاتھ میں پکڑی رنگوں بھری پلیٹ اس کے اپنے کپڑوں پر نقش و نگار بنا گئی۔

☆☆☆

وہ آفس سے نکل کر سیدھا فلاور شاپ پر گیا تھا۔ ایک خوبصورت سا بکے بنوا کر اور کچھ الگ سے تازہ پھول لے کر وہ واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ بکے کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھوٹی سی نفیس سی ڈبیا نکالی۔ ایک بار اسے کھول کے دیکھا۔ ناک کی لونگ کا خیرہ کن ڈائمنڈ جگر جگر کر رہا تھا۔ اس نے اسے بند کیا اور بوکے کے درمیان میں احتیاط سے ایڈجسٹ کر دیا۔ آج سلسبیل کی سالگرہ تھی۔ شادی کے بعد کیلیفورنیا آئے اسے ڈھائی ماہ ہو چکے تھے۔ وہ اسے یونیک سا گفٹ دینا چاہتا تھا اور ناک کی لونگ سے زیادہ منفرد تحفہ اس کی نظر میں اور کوئی نہیں تھا کیونکہ سلسبیل نے اسی کی شدید خواہش پر ناک چھدوائی تھی۔ اسے عورت کا یہ سب سے چھوٹا زیور بہت بھاتا تھا۔ اس نے تصور

www.pklibrary.com

میں اس لونگ کو سلسبیل کی ناک میں سجے دیکھا تو بے اختیار اس کے ہونٹ مسکرا دیے۔

شادی کے بعد بہت جلد حسان نے سلسبیل کو کیلیفورنیا بلوا لیا تھا مگر آرزو زیادہ تر پاکستان کا ٹکٹ کٹائے رکھتی تھیں۔ داجی اور ادے اپنی لور کے بغیر بہت جلد اداس ہو جاتے تھے۔ عباد صاحب مسکین سی صورت بنائے انہیں دھمکاتے تھے کہ میں دوسری کر لوں گا۔ تو وہ جی کھول کر ہنستیں۔ عباد صاحب خود بھی اسٹور کی دیکھ بھال حسان کے حوالے کر کے ساتھ ہی نکل لیتے۔

یوں ان کا پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں زینیا بھی پورا خیال رکھتی تھی۔ آج کل بھی آرزو پاکستان میں تھیں اور دن میں کئی بار ان دونوں کی خبر گیری کرتی تھیں۔ سچ بات تو یہ تھی کہ حسان کو انہوں نے ہی سلسبیل کی سالگرہ یاد کروائی تھی ورنہ وہ ایسے معاملات میں کورا تھا۔ زینیا کل شام سے آئی ہوئی تھی اس لیے سلسبیل کے اکیلے ہونے کی فکر نہیں تھی۔

گھر واپسی سے پہلے اس نے گاڑی کا رخ کہیں اور موڑ لیا تھا۔ ترتیب اور سلیقے سے بنی قبروں والا وسیع و عریض قبرستان ہمیشہ کی طرح سنسان تھا۔ وہ گاڑی پارک کر کے اترا اور گیٹ کھولتا اندر چلا آیا۔ نگاہ سیدھی سب قبروں کو پھلانگتی ''یار'' کی قبر سے جا چپکی۔ ہر بار کی طرح اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سال سے زیادہ ہو گیا تھا مگر اب تک یسار کی جدائی کا زخم بے تحاشا رستا تھا۔ وہ یسار کی قبر کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ فلاور شاپ سے لیے تازہ پھول اس کی قبر پر رکھتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے آنکھ میں آیا آنسو جھٹکا اور مصنوعی خفگی سے بولا۔

''کیوں ہنس رہا ہے کمینے! مجھے زہر لگتی ہے تیری ہنسی۔ مجھے پتا ہے کہ تو بہت خوش ہے لیکن یار میرا دل اب تک نہیں لگتا۔''

اس نے چہرہ اتنا جھکا لیا کہ ٹھوری سینے سے چھونے لگی۔

''مجھے تو بہت یاد آتا ہے یار۔ بڑے بابا اور آرزو ماما محض تیری یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے پاکستان چلے جاتے ہیں، وہ دونوں بظاہر ہنستے بولتے ہیں لیکن بوڑھے لگنے لگے ہیں۔ تو ہم سب کی زندگیوں کو جام کر گیا ہے یار۔''

اس نے یاسیت سے پیشانی اس کی قبر کی نم مٹی سے ٹیک دی۔ یک دم ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا میں تیزی سی آئی تو حسان فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

''پتا ہے۔ پتا ہے۔ تجھے میرا اداس ہونا پسند نہیں۔ لیکن میں کیا کروں یار، مجھے تیرے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔''

ایک لمبا سانس خارج کر کے خود کو ریلیکس کیا اور بولا۔

''دیکھ سب کچھ ہو گیا۔ ویسا ہی جیسا تو چاہتا تھا۔ داجی نے آرزو ماما کو سینے سے لگا لیا۔ ان کے میکے کے دروازے ایک بار پھر ان پر کھل گئے۔ سلسبیل کو میں نے اپنا لیا۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں یار۔'' سبک سی ہوا نے اس کے چہرے سے مس ہو کر اس بات پر شکریہ ادا کیا۔

''اور آج میں پورے دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ سلسبیل کو مجھے دان کر کے تو نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے یار۔ ورنہ میں تیری جدائی کے غم میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ اس نے مجھے سنبھالا ہے۔ میرے غم کا مداوا ہے وہ۔ وہ میری زندگی میں تیرا دیا گیا لازوال تحفہ ہے یار۔ تیرا شکریہ مجھ پر ادھار تھا۔ ادا نہ کرتا تو، تو مجھے راتوں کو خواب میں آ آ کر ڈراتا۔ شکریہ میرے یار۔

اس نے ایک ادھ کھلی کلی اٹھائی، اسے چوما اور واپس قبر پر رکھ دیا۔ وہاں سے اٹھ کر واپس گاڑی میں آ کر بیٹھنے تک یسار کی خوشبو اس کے وجود کے ساتھ لپٹی ہمراہ تھی۔ اس نے گاڑی گھر کے رستے پر ڈال دی۔ سلسبیل کا خیال پوری شدت سے اس کے حواسوں پر غالب ہوا۔ گھر جا کر اسے اپنی بیلا کو اعتبار اور محبت سے چنے ان پھولوں کے گلدستے کو پیش کرنا تھا جس کی مہک تمام عمر ان کے رشتے کو مہکاتی رہتی۔

www.pklibrary.com